

# مالا (نمرہ احمد)

”کہ“

باب دوم

قط نمبر: ۹

ہر سانس کے ساتھ  
کھو جاتا ہے گزرا ہوا الحجہ۔  
اور شروع ہوتا ہے ایک نیا الحجہ۔  
ہم سانس اندر کھینچتے ہیں۔

اور اسے باہر خارج کر کے  
ماضی کے لمحے کو چھوڑ دیتے ہیں۔  
اب وہ ہمارے لیے فنا ہو چکا ہے۔

اور یہ کرتے ہوئے  
ہم فنا کر دیتے ہیں  
اس انسان کو

جو ہم ایک الحجہ پہلے تھے۔  
ہم سانس اندر کھینچ کے  
نئے لمحے میں سانس لے کر  
اس شخص کا استقبال کرتے ہیں  
جو ہم بننے جا رہے ہیں۔

اور یوں ہم

اسی عمل کو دھراتے رہتے ہیں۔

یہی مراقبہ ہے۔

یہی تجدید ہے۔

یہی زندگی ہے۔

(لام سوریا داس)

مبین منزل میں بننے بیڈر و مزدیں واحد ماہی کا کمرہ تھا جس کی کھڑکی عقبی صحن میں کچن گارڈن کی طرف کھلتی تھی۔ چند روز قبل وداع ہوئی فاختہ کی قبر بھی وہیں تھی۔ اس کی مٹی کارنگ اطراف جیسا ہو گیا تھا اور اس پر نہیں نہیں سی گھاس اگ رہی تھی۔ مالا کھڑکی سے نظر آتی اس قبر کو دیکھ رہی تھی جب معید کھنکھارا۔

”تم نے فیصلہ کر لیا ہے؟“

اس نے چہرہ موڑ کے اپنے بھائی کو دیکھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ ساتھ بر اجمان ماہی، گود میں رکھی چاولوں کی پلیٹ میں لہتے کھاتے ہوئے ان کی طرف متوجہ تھی۔ وہ تینوں اس وقت ماہی کے کمرے میں تھے جس میں جگہ جگہ بے بی فیڈ رز، فارمولہ لکب کے ٹن اور ایسی دیگر اشیاء بکھری تھیں۔

”زیاد اور میں نے مل کر فیصلہ کیا ہے۔ ہم دونوں کو اپنی آئینہ زندگی کے لیے یہ بہترین لگا ہے۔“ وہ پر اعتماد تھی۔ معید نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور دھیرے سے مسکرا دیا۔

”مجھے زیادہ میشہ سے پسند رہا ہے۔ ویل میزرڈ۔ اچھی جاپ کرتا ہے۔ ڈائینٹ ہے۔“

”ڈائینٹ ہے لیکن.....“ ماہی نے ساتھ پر چاولوں کا چیچ منہ میں رکھا۔ وہ دونوں اس کے لیکن پر چونک کے اسے دیکھنے لگے۔ وہ گڑ بڑا گئی اور جلدی جلدی چاولوں کو حلق سے نیچے اتارا۔ پھر پانی کا گھونٹ بھرا اور کھنکھاری۔

”لیکن تمہیں زیاد سے بہتر بھی کوئی مل سکتا ہے۔“

”تمہیں زیاد میں کیا برائی نظر آتی ہے؟“ وہ چونکی۔ ماتھے پر لکیریں ابھریں۔ اسے ماہی کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔

”زیاد ذرا.....“ ماہی الجھ کے رک گئی۔ جیسے کچھ حلق میں انک جاتا تھا۔ جیسے کوئی سوچ جکڑ لیتی تھی۔ ”مجھے نہیں

معلوم۔ بس سوچ لو۔“

”تم بھی سوچ لو ماہی۔ سفید چاول کھائے جا رہی ہو۔ جانتی ہو یہ صحت کے لیے کتنے نقصان دہ ہوتے ہیں؟“

معید نے اس کی پلیٹ کو افسوس سے دیکھا۔ ماہی کے ماتھے پہ بل پڑے۔ زور سے چیچی پلیٹ میں رکھا۔

”سب میرے کھانے کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟“ وہ مزید کچھ کہتی لیکن فون بخشنے لگا۔ ایک خفاف نظر دونوں پہ ڈال کے پلیٹ اور فون اٹھائے وہ وہاں سے اٹھا آئی۔

”خالہ کی کال ہے۔ میں سن کے آتی ہوں۔“ جاتے جاتے بھی معید کو شدید بری طرح گھورا تھا۔

”کون سی خالہ؟“ معید نے غائب دماغی سے پوچھا۔ مالا نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”ہماری کتنی خالائیں ہیں، معید؟ ایک ہی تو ہیں۔ ماں اور نور جہاں خالہ کی سب سے بڑی بہن۔ شر جہاں۔“

”ایسے کہو شر خالہ۔ ماہی کی ساس۔ تم لوگ بھی ہر پڑوسن کو خالہ بنایتی ہو۔ مجھے کیا پتہ؟“ وہ نہس دیا اور مala افسوس سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”خالہ کا طرز تھا طب ہم صرف شر خالہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تمہیں سگی خالہ اور پڑوسنوں میں فرق معلوم ہونا چاہیے۔ رشتے داریاں یاد رکھنا صرف لڑکیوں کا فرض نہیں ہوتا۔“

وہ دونوں اب آپس میں الجھد ہے تھے۔

اور کچھ میں کھڑی ماہی موبائل کا ان ہے لگائے سادگی سے اپنی ساس کو بری فنگ دے رہی تھی۔

”ابھی گینیز آٹی نے صرف فون پر معید اور مجھے بلات کی ہے۔ اگلے ہفتے وہ انگل کے ساتھ پاکستان آئیں گی تو ہم بات پکی کریں گے۔“

”گینیز کے گھر رشتہ کیوں کر رہے ہو تم لوگ؟“ خالہ جھنجھلا کیں۔ ماہی چوکی کیوں؟ کیا ہوا؟“

”وہ لوگ مala کے قابل نہیں ہیں۔ اتنی جلدی مت کرو۔“

”مگر خالہ... زیاد میں کیا برائی ہے؟“ ماہی الجھسی گئی۔

”Mala کو اس سے بہتر برمل سکتا تھا۔“ وہ افسوس سے بولیں۔ ماہی نے بے اختیار لاونچ کے پار اپنے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔ ابھی بھی تو اس نے بھی کہا تھا۔

”آپ Mala سے بات کر کے دیکھیں۔“

”میں خود آکے اس سے بات کروں گی۔“

”مگر آپ نے دو ماہ بعد آنا ہے۔ فون پر بات کر لیں۔“ وہ بے چین ہوئی۔

”یہ باتیں فون پر نہیں ہوتیں۔ اور تم لوگ فوراً جواب نہ دو۔ تھوڑا وقت مانگو۔ دو تین ماہ تو لڑکی والوں کی چوکھت پر لوگ جوتے گھساتے ہی ہیں۔“ وہ آرام سے بولیں۔ ماہی نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔  
وہ واپس آئی تو قدرے غائب دماغ سی لگ رہی تھی۔

”خالہ کیا کہہ رہی تھیں؟“ ملا نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سوق میں گم دھپ سے صوفے پر بیٹھی۔

”خالہ چاہتی ہیں کہ ہمان کے آنے کا انتظار کریں اور رشتہ ان کی موجودگی میں طے ہو۔ ہماری طرف سے کسی بڑے کا ہونا بھی ضروری ہے۔“ اس نے الفاظ جوڑے۔

”میں ہوں نا۔“ معید کو پچھہ برالگا۔ ”اور ماہوں بھی آجائیں گے۔ مسئلہ کیا ہے؟“

”خالہ ابھی لمبا سفر نہیں کر سکتیں۔ ان کے گھنٹے کی سرجری ہوئی ہے نا۔ ماں کی ڈیتھ پر بھی اسی لیے نہیں آسکیں۔ ہمان کا انتظار کر سکتے ہیں۔ جنوری کے آخر تک وہ آجائیں گی اور میں تو مارچ تک یہیں ہوں۔“ بظاہر اس نے بے پرواہی سے شانے اچکائے البتہ کمرے میں پھیلا تنا و سب محسوس کر سکتے تھے۔

”نگینہ آنٹی کینسر پیشہ ہیں۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ وہ دو ماہ میں شادی کی بات کر رہی تھیں۔ اور تم کہہ رہی ہو، ہم رشتہ تک طے نہ کریں۔“ معید خفا ہوا۔ ماہی نے شانے اچکا دیے۔

”ٹھیک ہے۔ جیسے تم لوگ کہو۔“ کمرے میں چند لمحے کے لیے تاؤ بھری خاموشی چھا گئی۔ پھر ماہی کو جیسے کچھ یاد آیا۔

”ویسے نگینہ آنٹی چند دن پہلے پاکستان تھیں نا۔ جب انہوں نے حور کو گھٹتی دی تھیں پھر واپس کیوں چلی گئیں؟“

”وہ ہر مہینے صرف پانچ دن کے لیے پاکستان آتی ہیں۔ یہ ان کی پرانی روٹیں ہے۔“

”جھکتی نہیں ہیں اتنے ٹریوں سے؟ یہاں بھی ہیں۔“

”میں نے بھی زیاد سے یہی پوچھا تھا۔ لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ تین گھنٹے کی تو فلاٹ ہے۔ اور نگینہ آنٹی کو اپنالا ہور والا اگر بہت عزیز ہے۔ یہاں آکے وہ بہتر محسوس کرتی ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور زمی سے ماہی کو دیکھا۔

”خالہ جب بھی آئیں، موست ویکم۔ لیکن میں اپنی زندگی کے فیصلے اپنے رشتے داروں کے فلاٹ شیڈ یوں کے مطابق نہیں کر سکتی، ماہی۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔“ اس کا انداز نرم مگر دلوک تھا۔ ماہی کا سرا ثابت میں بل گیا۔ جب ملا فیصلہ کر لے تو کوئی چیز اس کو اس فیصلے سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔



”کیا میں نے درست فیصلہ کیا ہے؟“

اس دو پھر صفورا اور وہ ایک ریسٹوران میں آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ ان کے اوپر شیشے کی چھت بنی تھی جس پر جگہ بوگن دیلیا کے گلابی پھول نظر آرہے تھے۔ دیواریں بھی شیشے کی تھیں جو کہیں سے اوپرے پودوں سے ڈھکی تھیں۔ اور کہیں سے سرما کی نرم دھوپ کو اندر آنے کا راستہ دے رہی تھیں۔

اس نے صفورا سے یہ سوال اپنے لمحے کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا جو اس کے سامنے آنچھووار کھاتھا۔

صفورا اپنے لمحے کی تصویر کھینچ رہی تھی کیونکہ وہ اپنا کھانا انشاگرام کے اجنبیوں کو دکھانا فرض سمجھتی تھی۔ اس سوال پر چونک کے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ مالا کی آنکھیں پلیٹ پر جھکی تھیں۔ سیاہ بال چہرے کے دونوں اطراف میں گر رہے تھے۔ بزرگار ڈیگن کے اندر جھانکتے سفید کرتے کے گرد بیان پر سیاہ فاختہ والا کٹ جگمگار ہاتھا۔ کچھ تھا کشمائلہ کے چہرے پر جو اس کر دینے والا تھا۔

”بہترین فیصلہ ہے۔ زیاد کے بارے میں جتنا میں نے تم سے سنائے، وہ ایک شاندار انتخاب ہے۔ اپنے فیصلے پر شک کیوں کر رہی ہو؟“ صفورا نے چھری کا نشاپلیٹ میں چلانا شروع کر دیا۔

”کہیں میں جلد بازی سے کام تو نہیں لے رہی؟ یعنی دو ماہ میں شادی۔“ اس نے نگاہ اٹھا کے صفورا کو دیکھا۔ وہ کانے کو چکن فلے میں گاڑے، چھری سے ایک مکلا اکھاڑا رہی تھی۔

”انتظار کس کا کرنا ہے؟ امی رہیں نہیں۔ یہاں رہ کے کیا کروں؟“ وہی جاؤ اور نئی زندگی شروع کرو۔“ پھر اس کا چہرہ دیکھ کے صفورا نے ہاتھ روکا اور ایک گھری سانس لی۔

”تم بتاؤ مالا۔ تم جلد بازی کیوں کر رہی ہو؟“

اور وہ جیسے ایک دم سے بولنے لگی۔

”کیونکہ میں لا ہور میں مزید نہیں رہنا چاہتی۔ یہاں ہر طرف ماں کی یادویں ہیں۔ ڈپریشن ہے۔ ایک طویل عرصے سے کوئی میرا تعاقب کرتا آیا ہے۔ میں اس سب سے یچھا چھڑانا چاہتی ہوں۔“

”اب تو وہ تعاقب نہیں کر رہا؟“ صفورا نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”دنیں۔ کیونکہ میں نے اس کا تعاقب چھوڑ دیا ہے۔“

ذہن کے پردے پر با تھروم کے نسل والا واقعہ ہرایا۔ اور اسٹوڈیو میں پڑا کارٹن جس میں اس نے عامل کے متعلق جمع کی گئی معلومات کو سیل بند کر دیا تھا۔ وہ باب ختم ہو چکا تھا۔

”میں نے دہنی میں کچھ جگہوں پر جا ب کے لیے اپلاں بھی کیا ہے۔“ اس نے بالآخر چھپری کا نٹا اٹھایا۔

”چھر مسئلہ کیا ہے؟“

”کچھ ہے میرے اندر جو مجھے کہتا ہے کہ زیاد میرے لیے بہترین چوائیں نہیں ہے۔“ وہ ابھی ہوئی لگ رہی تھی۔

”کیا تمہیں زیاد سے محبت ہے؟“

”کیا مجھے زیاد سے محبت ہے؟“ اس نے اتساویں کیا۔

”نہیں ہے؟“ صفورا نے بغور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”پتہ نہیں۔“ اس نے بال کاں کے پیچھے اڑ سے۔ سبز آنکھوں میں ادا سیستی تھی۔

”مجھے اس کے لیے ایک بے چین کر دینے والی کشش محسوس ہوتی ہے۔ جیسے کچھ کھینچتا ہوا اس کی طرف۔ وہ سامنے ہو تو سب سے اہم وہی لگتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی خواہش ہوتی ہے کہ جلد سے جلد میں کوئی فیصلہ کروں ورنہ میں اسے کھو دوں گی۔“

”شروع شروع میں محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔“ اس نے بے پرواہی سے اسٹیک کا لکڑا منہ میں رکھا۔

”واقعی؟“ وہ دھیرے سے نہیں سمجھی محبت مختلف محسوس ہو گی۔

”مختلف کیسے؟“

مالا نے تھوڑی پہ ہاتھ رکھا اور نظریں اٹھا کے چھپت سے لکھتی بونا و پلیا کی بیلوں کو دیکھا۔

”میں سمجھتی تھی کہ محبت بے چین اور جلد بازی کروانے والی نہیں ہو گی۔“

”چھر کیسی ہو گی؟“

”بے چینی، سکون کا الٹ ہے۔ کھود دینے کا ڈر، تحفظ کا الٹ ہے۔ میں سمجھتی تھی محبت میں کھود دینے کا ڈر نہیں ہو گا۔ سکون ہو گا۔ تحفظ ہو گا۔“

(وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اور کیف خاموشی سے ڈر ایسو کر رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر کنال کے ساتھ لگے درخت بھاگتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔)

”میں سمجھتی تھی محبت کمفرمبل کر دینے والی ہو گی۔ آنکھوں کی تھنڈک ہو جیسے۔ تحفظ کا احساس۔“

(وہ کار کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ اور وہ دھوپ میں کھڑی تھی۔ قریب آئی تو دھوپ کا راستہ رک گیا۔ ہر طرف چھایا تھی۔)

”میں سمجھتی تھی کہ میں اپنی محبت کے ساتھ جہاں بھی ہوں گی، خوش ہوں گی۔ مجھے خوشی کی تلاش میں ایک نئے شہر جا کے نئی زندگی نہیں بسانی پڑے گی۔“

(وہ دونوں عثمان کی بیٹھک میں موڑھوں پر بیٹھے تھے۔ سامنے مٹی کے پیلا دوں میں مہک اڑاتی چائے اور نان خطا نیاں رکھی تھیں۔ وہ چائے سے اٹھتے دھوئیں کو دیکھتے ہوئے کچھ کہر رہا تھا اور وہ مسکرا کے اسے سن رہی تھی۔)

”دیکھو میری ارتیخ میر تج ہوئی تھی۔ میرا تجربہ مختلف تھا۔“ صفورا کے چھری کا نشا چلانے کی آواز سے کوئی فسوں سا ٹوٹا۔ وہ چونکے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”یہ بے چینی وغیرہ شادی سے پہلے ہوتی ہے۔ شادی کے بعد زندگی میں ٹھبراو آ جاتا ہے۔ ایک ہی انسان سے روز اڑائی اور روز صلح ہوتی ہے۔ وہ ایک اچھا انسان ہے۔ تمہیں خوش رہے گا۔ ویسے بھی مرد کی شکل کون دیکھتا ہے۔“

”شکل؟“ وہ ایک دم چوکنکی۔ ”زیاد کی شکل کو کیا ہوا؟“

”نہیں دراصل....“ صفورا اگر بڑا گئی۔ ”میرا مطلب تھا، تمہارے مقابلے میں بہت پُرس چار منگ نہیں ہے لیکن اچھا ہے۔ ڈائیسٹ ہے۔ اور شکل میں کہاں میٹر کرتی ہیں یا ر۔ اخلاق اچھا ہونا چاہیے۔“

”یعنی تمہیں وہ نارمل لگتا ہے؟“ وہ قدرے خفا ہوئی اور اپنے کھانے پر جھک گئی۔ ”مجھے تو وہ بہت ہینڈسم لگتا ہے۔“

”یہی تو محبت ہے۔ نارمل انسان بھی بہت اچھا لگتا ہے۔“ صفورا نہیں دی تو وہ بھی مسکرا دی۔

”زیاد تھوڑا تباخ ہے۔ اس کی منگیتکی موت کاڑا ما بھی تک تازہ ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ محبت سے اس کو فکس کر سکتی ہے۔“

اس بات پر صفورا چوکنکی۔ چھر کھنکھاری۔ ”مالا... کوئی عورت کسی مرد کو جو زندگی سکتی۔ نہ heal کر سکتی ہے۔ نہ فکس کر سکتی ہے۔“ شادی کے بعد وہ بد لے گا نہیں۔ تھوڑا بہت تمہارے طریقے پر ڈھل جائے گا۔“

ویٹر ڈنکس کی ٹڑے اٹھائے ان کے قریب آیا اور ادب سے ایک گاں صفورا کے سامنے رکھا۔

”غلط۔ محبت انسان کو بدلتی بھی سکتی ہے اور فکس بھی کر سکتی ہے۔ محبت ہی تو heal کرتی ہے۔ یہ سب سے بڑا مرہم ہوتی ہے۔“ وہ مسکرا کے اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوئی۔ صفورا کچھ کہنے لگی تھی لیکن اسی وقت ویٹر دوسرا گاں رکھنے جھکا ہی تھا کہ گاں ہاتھ سے سلپ ہوا۔ بہت سا منٹ مار گریا کشمکش کے کندھے پر جا گرا۔

”اندھے ہو کیا؟ دیکھنہیں رہے؟“ صفورا ایک دم غرائی۔

”صفورا... اُس اور کے۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کے اسے آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر نیکپن اٹھایا اور پر سکون انداز میں اپنا کندھا صاف کیا۔

”سوری میم۔ ریلی سوری۔“ کمزور ساویٹر گھبرا کے جلدی جلدی معدرت کرنے لگا۔

”کوئی بات نہیں۔ دوسرا ڈر نک لے آئیں۔ میں اسے واش کر لیتی ہوں۔“ وہ زمی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ریسٹ رومن سے واپس آئی تو دیکھا، صفورا کے پاس مینجر اور ویٹر کھڑے معدرت کر رہے تھے۔ اور وہ خفگی سے ان کو ڈانٹ رہی تھی۔

”اُس اور کے، صفورا۔ جانے دو۔“ وہ واپس بیٹھی اور ان کو جانے کا اشارہ کر دیا۔ صاف نیکپن گود میں بچھایا۔ پھر محسوس ہوا، صفورا اسے ناراضی سے گھور رہی تھی۔

”اسے سزا ملنی چاہیے تھی مالا۔ ورنہ سیکھے گا کیسے؟“

”اس نے میرا کار ڈیگن خراب کیا۔ اور تمہاری ڈانٹ نے اس کا پورا دن خراب کر دیا۔ حساب برابر۔ اب اپنی انماں کے پیچھے میں کسی غریب کو اس کی نوکری سے نہیں نکلا سکتی۔“

وہ پلیٹ اپنی طرف کھسکائے، کھانا و بین سے شروع کر چکی تھی۔

”انا کہاں سے آگئی درمیان میں؟“ صفورا خود بھی راستوران مینجر تھی۔ اس کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ وہ جو بآدھیرے سے بنس دی۔

”بُنس کیوں؟“

”پچھے نہیں۔ پچھے یاد آگیا تھا۔“ وہ مسکراہٹ دبائے سر جھکا کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کا دل اب ہلکا تھا۔ وہ درست فیصلہ کر رہی تھی۔



”ناممکن۔ ایک دم ناممکن۔“

روم نمبر ۵۵۵ کی کھڑکی کا بلا سند اوپر اٹھا تھا جس کے باعث بظاہر تیز لیکن درحقیقت ٹھنڈی دھوپ اندر داخل ہونے کا راستہ بنا چکی تھی۔ سورج کسی ہمسایہ عمارت کی اوٹ میں تھا، اس لیے دھوپ کا رخ تر چھا تھا۔ وہ صرف کھڑکی کے ساتھ رکھ کر کا واقع تک پہنچ پا رہی تھی جس پر بیرونی فرید چپ چاپ، گہری سوق میں ڈوبایا بیٹھا تھا۔

دیوار پر لگے کاغذ، میزوں پر بکھرے دستے، سب کچھ ایسے صفائی سے سمیٹا جا چکا تھا کہ جیسے کچھ پھیلا یا ہی نہ

ہو۔ ماہر بیڈ کی ٹیک سے کمر لگائے، تانگیں لمبی کیے نیم دراز تھا۔ سر پچھے تکیے پر تھا اور آنکھیں دائیں باکیں شہلتے چنگیز پر جمی تھیں۔

”ناممکن۔ کوئی کسی پر محبت کا جادو کیسے کر سکتا ہے؟“ چنگیز جھنجھن جلا گیا تھا۔

”جیسے شمس نے میری ماں پر کروایا تھا۔“

”ہو سکتا ہے تمہاری ماں کو شمس کی کوئی خوبی اچھی لگی ہو۔“

”شمس میں کوئی خوبی نہیں تھی۔“ وہ سپاٹ نظروں سے چنگیز کو دیکھ رہا تھا۔ ”سر کار اس جادو میں ماہر ہے۔ وہ کسی پر بھی سحرِ عشق کرو سکتا ہے۔“

”سر کار کا کوئی ای میل ایڈر لیں نہیں مل سکتا؟ میرے تو سارے مسئلے حل ہو جائیں۔“ سوق میں ڈوبایر بل کھنکھارا۔

لیکن کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

”تمہیں کیسے معلوم سر کار اس جادو میں ماہر ہے؟“ چنگیز اب مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ماہر نے شانے اچکائے۔

”میں نے دونجع دو چار کیا ہے۔ اس الہم میں میری ماں کی تصویر بھی تھی، اور کشمائلہ کی بھی۔ میں سمجھتا تھا کہ الہم والی عورتوں کو سر کار نے مردا دیا ہے یا مردا نا ہے۔ اس لیے میں کشمائلہ کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کے ساتھ وہ نہ ہو جو میری ماں کے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن میں غلط تھا۔“ اس نے پیچ کی آواز نکالی گویا خود پر افسوس کیا۔

”یعنی الہم والی عورتوں پر دراصل سر کار نے جادو کیا تھا؟“

”بالکل۔ اس نے مختلف کائنات کے لیے مختلف عورتوں پر سحرِ عشق کیا تھا۔ سر کار ایک ٹرو فی ٹکلیکٹر بھی ہے۔ اپنے ہر شکار کا حساب رکھتا ہے۔“

”میں نہیں مانتا۔ کوئی کسی کے دل میں اپنی محبت جادو کے ذریعے نہیں پیدا کر سکتا۔“ چنگیز نے ناک سے مکھی اڑائی۔

”درست۔“ اس نے سرتانید میں ہلایا تو وہ دونوں چونک کے اسے دیکھنے لگے۔

”کیا مطلب؟“

”سحرِ عشق کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ کیونکہ کوئی انسان جادو کے ذریعے کسی کے دل میں اپنی محبت پیدا نہیں

کر سکتا۔“ وہ نیک لگائے، سنجیدگی سے ان سوالات کے جواب دے رہا تھا۔

”لیکن تم نے کہا سحرِ عشق اثر کرتا ہے۔“ سب سے زیادہ مایوسی بیر بل فرید کو ہوئی تھی۔

”سحرِ عشق، عشق نہیں ہوتا۔ سحر ہوتا ہے۔ ایک الوزن۔ محبت کا ایک سراب۔ ایک مصنوعی احساس جو ساحرِ محبوب کے دل میں جگاتا ہے۔ محبوب اس کو محبت سمجھتا ہے اور....“ اس نے تھوک نگا۔ ”اور اپنے ساحر کو اپنی زندگی میں شامل کر لیتا ہے۔ جیسے ہماری ماں نے کیا۔“

”ایک ہی بات ہے۔ محبت ہو یا اس کا احساس۔“

”ایک بات نہیں ہے، بیر بل۔ محبت ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے۔ سحر الوزن ہے۔ دور سے لگتا ہے سڑک پر پانی پڑا ہے۔ لیکن قریب آ تو پانی نہیں ہوتا۔ صرف دھوپ کا الوزن ہوتا ہے۔“

”یعنی سحرِ عشق جلدی ٹوٹ جاتا ہے۔“

”میں نہیں مانتا۔“ چنگیز نفی میں سر ہلاتے ہوئے کرسی پر بیٹھا۔ ”تم صرف زیاد سلطان سے جیلیں ہو۔ اور ہسپتال کے اس بند کمرے کی قید نے تمہارے ذہن پر اثر ڈالا ہے۔“

”ایسے مت کہو چنگیز۔“ بیر بل بلامان گیا۔ ”اس کے ذہن پر اثر بہت پہلے سے ہے۔ ہسپتال کے کمرے کا کیا قصور؟“

ماہر نے جواباً بس ایک نظر سے دیکھا اور کندھے اچکا دیے۔

”واللہ ما ہر فرید کبھی غلط نہیں ہوتا۔“

”تم یہ ثابت کر سکتے ہو؟“ چنگیز نے ٹانگ پہ ٹانگ کے جمائی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ کہنے لگا لیکن چنگیز نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ ”اور یہ مت کہنا کہ وہ ہینڈسم نہیں ہے۔ جب کسی اڑکی کو کسی آدمی سے محبت ہو جائے تو وہ اس کو ہینڈسم ہی لگتا ہے۔ میں نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔ وہ بد صورت نہیں ہے۔“

”میں نے کب کہا بد صورت ہے۔ صرف ہینڈسم نہیں ہے۔ وہ خود کو بد صورت سمجھتا ہے اسی لیے اس نے جادو کا سہارا لیا ہے۔“

”کیا تم یہ ثابت کر سکتے ہو؟“ اس نے چبا چبا کے اپنی بات دہرائی۔ ”کیونکہ اگر وہ واقعی جادو کروار ہا ہے تو تمہیں اس اڑکی کو بچانا ہوگا۔ کیا کہہ کے بچاؤ گے؟ کہ واللہ ما ہر فرید کبھی غلط نہیں ہوتا؟“

”میں ثابت کر سکتا ہوں۔“ اس کا انداز انہی تھا۔

”کیسے؟“

”نمبرز سے۔ سارے کھیل نمبرز کے ہیں۔“ وہ پہلی دفعہ ہلاکا سامسکرایا۔ اس کے گال پر لگے کٹ کا نشان ویسا ہی تھا البتہ چہرے کے نیل قدرے مندیل ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

”یعنی؟“

”میں اتنا جانتا ہوں کہ سرکار ایک ہائی پروفائل جادوگر ہے۔ اس کے کائنٹس پوری دنیا میں پھیلے ہیں۔ اور وہ با اثر لوگ ہیں۔ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ اس نے ابرو سے پلیٹر میں لپٹی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیونکہ وہ امیر لوگ ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ سرکار اپنے کام کی بھاری فیس لیتا ہے۔ زیاد نہ بھی دی ہوگی۔ ہے نا؟“

”زیاد کی بینک اسٹیٹ منٹ۔“ چنگیز نے چونکا۔ ”یقیناً کوئی منی ٹریل ہوگا۔“

”جادوگروں کو عموماً ماہانہ پے منٹ کی جاتی ہے۔ زیاد کے اکاؤنٹ سے ہر مہینے ایک خاص رقم کی ٹرازنیکشن کی جاتی رہی ہوگی۔ مجھے صرف اس اکاؤنٹ کوڈ ہوئڈ نا ہے جہاں وہ رقم جاتی ہوگی۔“

”کیا معلوم وہ کیش دیتا ہو؟“

”ہاں ہو سکتا ہے۔ لیکن تب بھی ہر ماہ اکاؤنٹ سے رقم نکلانے کا اندر ارج ہوگا۔ یوں میری بات ثابت ہو جائے گی۔“

”اس کے بینک اکاؤنٹس دبئی اور پاکستان دونوں ملکوں میں ہوں گے۔ اسٹیٹ منٹ کیسے نکلوادے گے؟“ چنگیز اب اس کی بات پر سوچنے لگ گیا تھا۔

”اس کی فکر مت کرو۔“ بیربل ہنسا۔ ”ہمارے پاس ایک ایسا انسان ہے جو کسی کے بارے کچھ بھی معلوم کر کے دے سکتا ہے کیونکہ اس کے ہر اہم ملک کے ہر اہم عہدوں پر دوست موجود ہوتے ہیں۔“

”کون؟“ چنگیز چونکا۔

”زارا۔“ وہ اب سر جھکائے زارا کو میسح لکھ رہا تھا۔

چنگیز بڑی بڑی کے رہ گیا۔

”ویسے جزل ناج کے لیے پوچھ رہا ہوں....“ بیربل سرسری سے انداز میں کھنکھارا۔ ”سرکار کی فیس کتنی ہوگی؟“

”بیربل۔“ اس کی آواز بلند ہوئی۔ بیربل نے فوراً سے ہاتھ اٹھا دیے۔

”مذاق کر رہا تھا یار۔“ پھر کسی خیال سے چونکا۔ ”تم نے کہا سحرِ عشق کا نجام بہت بھی انک ہوتا ہے؟ مگر کیسے؟“

ماہر فرید نے ایک گہری سانس کھینچی۔ اور پھر وہ کہنا شروع ہوا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کیف کی ولانا معمارت کے اندر لہلاتے سر بز پودے خاموشی سے درکرز کو کام کرتے دیکھ رہے تھے۔ شبم اپنے ڈیسک کے ساتھ کھڑی کاغذات کے ایک پلندے پر جھکائے ہوئے تھی جب قریب آتے قدموں کی آہٹ پر چونکی۔ سراٹھا کے دیکھاتو اور پر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچرہ گیا۔

عبدالمالک فرید لفت سے باہر آتے دکھائی دے رہے تھے۔ گرے سوت، سفید شرٹ، ڈامنڈ نائی پن، اور سلوور بالوں کو جیل سے جہائے ان کا چہرہ ہمیشہ کی طرح بے تاثر تھا۔ شبم ایک دم سیدھی ہوئی۔ نگاہوں نے ان کا پیچھا کیا۔ یہاں تک کہہ سیدھا زار اکے آفس کی طرف بڑھ گئے۔

شبم اب کے قدرے تجسس سے اس سمت میں دیکھنے لگی۔ مالک بے ”کیف“ کو اس قابل سمجھیں کہ خود وہاں تشریف لا نہیں، یہ ہر روز نہیں ہوتا تھا۔ کچھ تو تھا۔

انہوں نے شیشے کا دروازہ دستک کے ساتھ کھولا تو اپنی پیٹھی زار جھنجھلائی ہوئی ساتھ کھڑے ملازم سے کہہ رہی تھی۔

”ایک ڈھنگ کا قہوہ نہیں بناسکتے تم لوگ؟“ جاؤ اس کو۔ انگلیوں سے نہیں سی پیالی پرے دھکیلی۔ ملازم معدرت کرتا ہوا جلدی سے کپ اٹھانے لگا۔ قہوے کے چند قطرے چکل گئے۔ زار نے ان کو آتے دیکھاتو خاموش ہوئی۔ لگتا تھا جیسے کافی دیر سے اس کی کلاس لی جا رہی ہو۔

وہ بغور اس کی پیشانی کے بل دیکھتے ہوئے سامنے آئے اور کرتی کھینچی۔

”اپنی shallow ego کی وجہ سے اس کو نوکری سے نکالوگی کیا؟“ ساتھ ہی ملازم کو ابرو سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی جلدی ثرے سمیٹتا باہر کو لپکا۔

”آپ کیسے آئے، بابا؟“

اس کے کھلے بال دونوں کندھوں پر curls میں سیٹ تھے۔ بنا آستین کے سفید بلا وز پہنے، جس کے گریبان پر شہری زنجیر جھول رہی تھی، ایکر لک ناخنوں کو بزرگ نیل پالش سے رنگے، وہ گھنی مصنوعی پلکیں جھکائے باپ کو دیکھنے کی بجائے کاغذات الٹا پٹا رہی تھی۔ ماتھے کے بل ہنوز قائم تھے۔

”کیونکہ فون پر لگا تم اپ سیٹ ہو۔“ ان کی آنکھیں کسی بھی تاثر سے عاری تھیں۔ جیسے برف کی ایک جھیل ہو۔

زار نے آنکھیں اٹھا کے انہیں شکایتی نظروں سے دیکھا۔

”ماہر سے ملے آپ؟ اس کے دوستوں نے میرا داخلہ بند کر رکھا ہے۔ عجیب لوگ۔“ ناپسندیدگی سے جھر جھری لی۔

”کیوں رہ رہی ہوان عجیب لوگوں میں؟ واپس آ جاؤ۔“ وہ بغور اس کو دیکھ رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ اس نے ٹھنڈے انداز میں ہنس کے ان کی بات ہوا میں نہیں اڑائی۔

اس نے فائل بند کی اور پیچھے کوٹیک لگائی۔ چہرہ ناراض ناراض ساتھا۔  
”میں یہاں خوش ہوں۔“

”اس کی زندگی میں تم کہیں نہیں ہو زارا۔“ پہلی دفعہ ان کی آواز میں دکھ سا بھرا۔ جیسے برف کی جھیل میں شگاف ظاہر ہوا ہوا اور ایک پتا اوپر تیرنے لگے۔

”میں اس کی بیٹ فرینڈ ہوں۔“

”تم اس کی زندگی میں کہیں نہیں ہو۔“ وہ آگے کو جھکے اور بات دہرائی۔

زارا کی آنکھوں میں گلبی سن نبی الہری

”آپ غلط ہیں۔ وہ آخر میں میرے پاس ہی آئے گا۔“

”تم اپنی زندگی ضائع کر رہی ہو۔ میرے ساتھ واپس چلو۔“

”تاکہ اپنی بہنوں کی طرح شادی اور بچوں میں زندگی ضائع کروں؟ کیوں بابا؟ آپ کو تو اپنے جیسی بیٹی چاہیے تھی۔“

”تمہیں اب تک معلوم نہیں ہوا کہ مجھے کیسی بیٹی چاہیے تھی۔“ وہ دھیرے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ برف واپس جم گئی۔ پتا کہیں نیچے منجمد ہو گیا۔

وہ ابھی دروازے تک پہنچے تھے جب زار نے لب کھولے۔

”اس نے مجھے ایک آدمی کی بینک اسٹیٹ منٹ نکلانے کے لیے کہا ہے۔ زیاد سلطان۔“

وہ ہینڈل پہ ہاتھ رکھ کر کھے مڑے۔

”کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

”کیا ماہر یہ سب کسی لڑکی کی وجہ سے کر رہا ہے؟“ وہ بنا پلک جھپکائے باپ کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ وہاں

صرف برف تھی۔

”ہاں۔ اور اس لڑکی کا نام ہلال ہے۔“ ذرا سے شانے اچکائے۔

”وہ ہلال کے لیے یہ سب نہیں کر رہا۔“ وہ ایک دم درشتی سے بولی۔ گارندھ گیا۔ ”کوئی لڑکی بھی ہے جس سے وہ لا ہو رہیں ملا تھا۔ اور آپ جانتے ہیں اسے۔“

وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئے۔ ہاتھ ابھی تک ہینڈل پر تھا۔

”سوال یہ ہے کہ آپ اس لڑکی کو protect کیوں کر رہے ہیں؟“ اس کی گیلی آواز بلند ہوئی۔

”ڈی جی صاحب کی بیٹی کی سالگرہ ہے۔ ضرور جانا ورنہ وہ برآمانے گا۔“ ایک ایک لفظ چبا چبا کے کہا اور دروازہ کھول کے باہر نکل گئے۔ شبتم جو تجسس سے اس طرف دیکھ رہی تھی، جلدی سے فائل میں چہرہ چھپائے رخ موڑ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہسپتال کے پرائیوٹ روم نمبر ۵۵۵ میں اس صحیح خاموشی پھیلی تھی۔ نہ کسی مشین کی آواز تھی، نہ انسان کی۔ وہاں کوئی موجود نہ تھا سوائے بستر پر ٹیک لگائے نیم دراز مریض کے۔ گال پر زخم کا نشان ویسا ہی تھا۔ آنکھ تسلی نیل بھی جامنی پڑ چکے تھے۔ وہ موبائل اپنیلر پر لکھئے دوسری جانب جاتی گھنٹی سن رہا تھا۔ اسکرین پر ”ون ان فنٹی“، جگہ گارہ تھا۔

وہ چند لمحے ان الفاظ کو دیکھے گیا۔ اسکرین دھیرے دھیرے پکھلنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ پکھلی چاندی کی طرح سارے پر چھا گئی۔ اس منظر نامے سے دھوئیں کا ایک مرغولہ اٹھا۔ سفید آسمان میں سیاہ دھواں۔ اور وہ وہیں رقم ہو گیا۔

یہ منظر اس پینینگ میں پینٹ کیا گیا تھا جو برسوں پہلے اس روز رانیل کے اپارٹمنٹ کی دیوار پر دکھائی دے رہی تھی۔

رانیل اس پینینگ تسلی پچھی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ ٹانگ پر ٹانگ جمائے، کانوں میں نخے ہیرے پہنے، ان کا چہرہ سپاٹ اور سرد تھا۔

”ماں پلیز... میں پھر سے آیا ہوں۔ آپ کی منت کرنے۔“ وہ ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ کلین شیو اور کم عمر چہرہ۔ ماتھے پر بکھرے بال۔ آنکھوں تسلی حلقے۔

”شمیں سے شادی نہ کریں۔ وہ آپ کو ہرث کر دے گا۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ لبھ میں لجاجت تھی۔ بے چین نگاہیں ان کی سر آنکھوں پر جمی تھیں۔

”تمہیں کیسے معلوم؟“، ”ابجہ سرد تھا۔“

”میں لوگوں کے بارے میں کبھی غلط نہیں ہوتا۔“ مس سب کچھ پلانگ کے تحت کر رہا ہے۔ وہ صرف آپ کی دولت کی وجہ سے آپ کے ساتھ ہے۔“

”یعنی تمہیں اپنی ماں اتنی ارزائی گئی ہے کہ کوئی اس کا ساتھ اس کے اپنے لیے نہیں چاہ سکتا؟“

”جو چاہتا تھا اسے آپ نے چھوڑ دیا۔“ اس کی آواز بلند ہوئی۔

”اور وہی تمہیں یہ سب سکھا کے یہاں بھیجا ہے۔ ہے نا؟“ انہوں نے بے رخی سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ وہ انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

”میرے بیمار باپ کے پاس سکھانے کے لیے وقت نہیں ہے۔“

”تم مجھے مس کے خلاف کیوں کر رہے ہو؟ تم اس کو جانتے تک نہیں ہو۔“

”ہر کوئی ماہر فرید کی بات کا اعتبار لے رکھتا ہے۔ آپ کیوں نہیں کرتیں؟“

دیوار پر لگی پینٹنگ کا رنگ سنہری پڑنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ سونے کی طرح پھلنے لگی۔

اس پچھلے سونے میں ایک دھوپ سے بھری صبح ابھرنے لگی۔

وہ دونوں دہلی گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ ماتھے پر ہاتھ کا چھجا بنائے اس کو دکھری تھی۔

”کیا آپ مجھ پر بھروسہ کرتی ہیں؟“

”ہاں۔“

”وہ آپ کو ہرٹ کرے گا۔“

”تم مجھے زیاد کے خلاف کیوں کر رہے ہو؟“ سبز آنکھوں میں شک تھا۔ ”تم اس کو جانتے تک نہیں ہو۔“

دھوپ ٹھنڈی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ سفید ہو گئی۔

ماہر نے آنکھیں کھولیں۔ وہ روم نمبر ۵۵۵ میں لیٹا تھا۔ اور اپنی کافون پر ماہ بینہ مبینہ ہیلو کہہ رہی تھی۔

”ماہر فرید کا کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ لیکن ایک کوشش کرنا چاہتا تھا۔“ اس کی آواز دھیمی تھی۔

”کیسی کوشش؟“ وہ اس اچانک سی فون کاں پر حیران ہوئی تھی۔

”اگر میں تمہیں کہوں کہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری ماں اور بہن پہ جادو کروانے والا سرکار کا کائنٹ کون ہے..... تو؟“

”بکیرہ تائی ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔“

ماہر فرید نے گہری سانس اندر کھپھی۔

”تم کئی برس سے انہی کو پنا دشمن گردانتی آئی ہو۔ اگر میں کسی اور کا نام لوں تو مان لوگی؟“

”مجھے ثبوت چاہیے ہوگا۔“ اس کا انداز قطعی تھا۔ ماہر کے لب ”اوہ“ میں سکڑے۔

”لیکن تمہیں میرا اعتبار نہیں ہے؟“

”ہمارے اوپر جادو کروانے والی میری ماں کی سب سے بڑی دشمن بکیرہ تائی ہی ہیں۔ میں کیسے یقین کرلوں کہ کوئی اور یہ کر سکتا ہے۔ ناممکن۔“

”زیاد... زیاد سلطان۔“ وہ ایک دم بولا۔ ”اگر میں کہوں کہ وہ تمہاری فیملی کا سب سے بڑا دشمن ہے، تب؟“  
چند لمحے کے لیے لائی خاموش ہو گئی۔

”پھر سے سگار پینے لگے ہیں؟“  
”مذاق نہیں کر رہا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ زیاد سلطان سرکار کا کائنٹ ہے۔“

”ماہر صاحب... میری بات سنیں۔“ اس کی آواز سے چھکلتا غصہ سات سمندر پار بھی اپنی حدت سے سارے کمرے کو دہکا گیا تھا۔ ”آپ نے مala کو دھوکہ دیا، میں نے اس بات کو جانے دیا کیونکہ مجھے آپ کی نیت پہ کبھی شک نہیں ہوا تھا۔ آپ کی وجہ سے مala اور میری لڑائی ہوئی۔ اس بات کو بھی میں نے جانے دیا۔ لیکن اب آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ آپ اس شخص پر ایزام لگا رہے ہیں جس سے میری بہن شادی کرنے جا رہی ہے۔“  
غصہ۔ دکھ۔ حرمت۔ اس کے لبھ میں کیا نہیں تھا۔

”میں غلط نہیں ہوں۔ زیاد تمہاری کہانی کا دلن ہے۔“ وہاں صرف ہٹ دھرمی تھی۔

”آپ یہ سب مala اور زیاد کی شادی روکنے کے لیے کر رہے ہیں نا؟“

”مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ اپنی زندگی میں کیا کرتی ہے۔ لیکن اگر وہ اس شخص سے شادی کرتی ہے جو میرے دشمن کا کائنٹ ہے، تو میرا فرض ہے کہ میں اسے یہ غلطی کرنے سے روکوں۔“

”مالا اپنا خیال خود کھسکتی ہے۔ آپ کو میرے یا اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ایک منٹ فون مت رکھنا۔“ وہ واقعی فون رکھنے والی تھی جب وہ تیزی سے بولا۔

”کیا زیاد تمہارے لیے کچھ لاتا ہے؟ کچھ میٹھا؟ ہر دفعہ ایک ہی چیز؟“ وہ سوق سوچ کے کہہ رہا تھا۔ ”چاکلیٹس... یقیناً چاکلیٹس....“

اب کے خاموش ہونے کی باری ماہی کی تھی۔

”آپ کو کیسے معلوم؟“ اسے اچنچا ہوا۔

”اسی لیے تم اس کا دفاع کر رہی ہو کیونکہ وہ ان چاکلیٹس کے ذریعے تمہاری مخالفت کو پہلے ہی حمایت میں بدل چکا ہے۔ میں مزید کوشش نہیں کروں گا۔ لیکن اگر میں تمہارے پاس ثبوت لے کر آؤں تو مان جاؤ گی؟“ لائیں خاموش ہو گئی۔ جیسے وہ خود بھی مخصے میں پڑ گئی ہو۔

”جب ثبوت ہو گا، تب بات کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ تب تک اس کی لائی ہوئی چاکلیٹس مت کھانا۔ ان میں جادو ملا ہوتا ہے۔“

”اُف....“ ماہی نے زور سے بٹن دبا کے کال کاٹی۔

”اس نے تمہارا یقین نہیں کیا؟“ بیرون ابھی ابھی کمرے میں آیا تھا۔ فرنچ سے ایک کین نکالا اور اس کے سامنے بیٹھا۔

”مجھے معلوم تھا وہ یقین نہیں کرے گی۔ وہ اس کا ہونے والا بہنوئی ہے۔ وہ اس کے مقابلے میں میری کیوں سنے گی؟“

”پھر اسے یہ سب کیوں بتایا؟“

”تاکہ اس کے دل میں شک کا بیج ڈال سکوں۔ اور....“ لاپرواہی سے شانے اچکائے۔ ”وہ یہ نہ کہہ سکے کہ میں نے اسے وارن نہیں کیا تھا۔“

اس نے موبائل ایک طرف ڈال دیا۔ بیرون جو کین بوں تک لے جا رہا تھا، رک کے اسے دیکھنے لگا۔

”بس؟ تم مزید کچھ نہیں کرو گے؟“

”نہیں۔ اب جو کہنا ہے انہوں نے خود کرنا ہے۔“ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ایک کتاب اٹھا لی اور بک مارک لگا صفحہ کھولا۔

”وہ لڑکی ایک ٹال، ڈارک اور ناٹ سوہنڈسم ولن سے شادی کرنے جا رہی ہے۔ تم اس کو بچاؤ گے نہیں؟“

”کوئی انسان کسی کو نہیں بچا سکتا۔ اسے اپنے آپ کو بچانا ہے اور مجھے اپنی بہن کو ڈھونڈنا ہے۔ مالک درست کہتا تھا۔ میرے جذبات درمیان میں نہیں آنے چاہیے تھے۔ ویسے بھی سحرِ عشق کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔“ وہ کتاب کھول کے چہرے کے سامنے کر چکا تھا۔ پیر بل ٹھہر کے اسے دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب؟ تم نے خود کہا تھا کہ جادو گر کسی پر بھی سحرِ عشق کرو سکتے ہیں۔“

”ہاں۔ نہیں کہا تھا کہ وہ کامیاب ہوتا ہے۔ بلکہ....“ اس نے پڑھتے ہوئے صفحہ پلٹایا۔ ”سحر عشق کا انعام وہ نہیں ہوتا جو تم سوچ رہے ہو۔“

اس کے لب بُل رہے تھے اور نیل زدہ آنکھیں صفحے پر جمی تھیں۔

دو ماہ بعد -

وہ ایک سرداور تاریک کمرہ تھا۔ اس میں کوئی فرنچی پر نہ تھا سوائے ایک پلنگ کے۔ مالا اس پلنگ پہ بیٹھی تھی۔ گھٹنے سینے سے لگائے، خوف سے چوکھت کو دیکھتی ہوئی۔

چوکھت پر دروازے کی جگہ ایک پر دہ لگا تھا، پر دہ دھیرے دھیرے ہوا سے لہر ا رہا تھا۔  
اس کی خوفزدہ آنکھیں پر دے پہ جھی تھیں۔

دفعتاً پردوے کے پیچھے سے ایک ہاتھ نکلا۔ مخفی سایوڑھا ہاتھ۔ اس نے پردهِ مٹھی میں دبایا۔ وہ اس کے سیاہ لمبے ناخن دیکھ سکتی تھی۔ اس نے گھٹنے مزید سینے سے لگائے۔ خود کو اپنے ہی بازوؤں میں پیٹھا۔  
ہاتھا ب پرده سر کار ہاتھا۔ ایک ایک انج۔ ایک ایک سانس۔  
پھر اس نے سرنکال کے اندر رجھا نکا۔

یہ ہی بچہ تھا۔ وہی منہوس صورت بچہ جس کے کان لمبے سر بڑا اور گول چہرہ تھا۔ بال غائب اور آنکھوں کی جگہ سیاہ گڑھے تھے۔

وہ اس کو دیکھ کر مسکرا یا۔ کھو جلی آنکھیں ہمکنے لگیں۔

ایک چیز کے ساتھ وہ جاگی۔

وہ اپنے بیڈروم میں تھی۔ بھاری کمبل اور پڑا لے، نیم گرم کمرے میں، کسی دوسرے کی موجودگی کے بغیر۔

اس نے کمبل اوپر سے ہٹایا۔ اپنی گردن کو چھووا۔ سارا وجود پسینے میں تر تھا۔

اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ دل زور سے دھڑک رہا تھا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سب کچھ نامل تھا۔ سوائے اس کے۔

اس نے پیر نیچے اتارے اور آگے بڑھ کے بقی روشن کی۔ ایک دم سارے میں روشنیاں تی پھیل گئیں۔

کمرے کے ایک کونے میں شانگ بیگز کا ڈھیر لگا تھا۔ گوکہ وہ سایقے سے رکھے تھے لیکن بہت جگہ لے رہے تھے۔ وہ ننگے پیر چلتی سنگھار میز تک آئی۔ اپنا عکس دیکھا۔ اس کا چہرہ بے داغ تھا۔ سپید اور خوبصورت۔ بہرہ اکھیں البتہ خوف سے بھری تھیں۔

آنینے کے کونے میں چند اسکلی نوش لگے تھے۔ ان پر کرنے کے کام لکھے تھے۔

چند کاموں کو لائیں لگا کے کاٹ دیا گیا تھا۔ باقی دیسے ہی تھے۔

نکاح کا جوڑا پک کرنا ہے۔

ویڈنگ رنگ خریدنی ہے۔

اس سے مزید کام نہیں پڑھے لئے۔ نظریں نیچے پھسل گئیں۔ میز پر سامنے نکاح کا کارڈ رکھا تھا۔ سفید کارڈ پر سنہری رنگ سے عبارتیں لکھی تھیں۔ کارڈ کے اوپری حصے پر ایک بے بی پھول چپاں تھا۔ نخا سا پھول۔ اس نے انگلیاں پھول پہنچیریں۔ نیچے نکاح کی تاریخ نظر آرہی تھی۔

آج سے ٹھیک دس دن بعد زیادا اس کی شادی تھی۔ صرف نکاح کا فناشن ہوا تھا۔ اور اسی شام رخصتی۔ گزشتہ دو ماہ سے شادی کی تیاریوں کے لیے بازاروں کے چکر لگاتے لگاتے اس کے ذہن نے وہ سب فراہوش کر دیا تھا۔

وہ احساس کہ کوئی تعاقب کر رہا ہے۔ کوئی اس کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ سب اسے بھول گیا تھا۔

وہ واقعات ہونے بھی ختم ہو گئے تھے۔ اب نہ کوئی خون کے چھینٹے تھے۔ نہ کھلتے بند ہوتے پانی کے نل۔ زندگی سکون میں تھی۔ اس نے بوڑھے جادوگر کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ اور یقیناً اس نے بھی مالا کا پیچھا ترک کر دیا ہو گا۔ لیکن آج کچھ نیا ہوا تھا۔

کئی ماہ بعد وہ خواب بھر سے دکھائی دیا تھا۔ وہی منہوس بچہ۔ Changeling

لیکن وہ اس کے قریب نہیں آ رہا تھا۔ جیسے فالے پر گھات میں بیٹھا ہو۔ کسی شے کا منتظر۔

اپنے عکس کو دیکھتی اس کی نظریں گردن میں جھولتی چین پڑھر گئیں جن میں سیاہ فاختہ پروئی ہوئی تھی۔ اس نے دو

انگلیوں سے فاختہ کو تھاما اور آنکھیں بند کر کے گہری سانس اندر کھینچی۔

پھر جب وہ سانس باہر خارج ہوئی تو اس کا خوف کم ہونے لگا تھا۔

صرف تین سانسیں کشمائلہ مبین کو پر سکون کر سکتی تھیں۔

چند لمحوں بعد وہ بیڈ پر بیٹھی، فون کان سے لگائے زیاد کو اپنا خواب سن رہی تھی۔ زیادا سے ہمیشہ کہتا تھا کہ اگر اسے دوبارہ برے خواب آنے لگیں تو وہ اس سے شیر ضرور کرے۔ شاید وہ دونوں مل کے اس کا کوئی مطلب نکال سکیں۔

”یقیناً کبیرہ آنٹی پھر سے شروع ہو گئی ہیں۔“ زیاد نے سنتے ہی تبصرہ کیا۔ ”ہمارے خاندان میں جادو کے لیے وہی مشہور ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کروانا چاہتی تھیں۔ ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے اب وہ میرا اور آپ کا رشتہ ختم کروانے کے لیے پورا ذریعہ نہیں گی۔ نکاح میں دس دن رہ گئے ہیں۔ ایک دفعہ نکاح ہو جائے تو ان کے جادو نہیں چل سکیں گے۔“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ زیاد درست کہہ رہا تھا۔ یہ سب کبیرہ تائی کر رہی تھیں۔ اور اگلے دس روز تک کرتی رہیں گی۔ اسے تیار رہنا تھا۔

اس نے ایک نظر کمرے میں رکھ لیا پنگ بیگز کو دیکھا۔ سب کچھ پر فیکٹ تھا۔ سوائے... چہرہ موڑ کے بیڈ کی دوسری سائیڈ کو دیکھا جو خالی تھی... سوائے اس ایک کمی کے جواب اب تک پوری نہیں ہو گی۔ ماں نہیں تھیں۔ لیکن گنگیز آنٹی تو تھیں نا۔ وہ بھی ماں کی طرح یہاں تھیں۔ وہ ان کی خدمت کہہ کے ان میں اپنی ماں ڈھونڈ سکتی تھی۔ وہ ادا سی سے مسکرا دی۔



لاہور کے آسمان پر پچھلی گدلي اسموگ نے مبین منزل کی کھڑکیوں کو دھنڈا دیا تھا۔

آنسوؤں سے تجھی اسٹوڈیو کی کھڑکی کے اندر شام کی مناسبت سے سفید بتیاں جلی تھیں اور چند نفوس اندر کام کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ایک چوکی پر مالا بیٹھی ایک بڑے سے چوکر فریم پر سر جھکائے ہوئے تھی جس کے اوپر ایک ریشمی کپڑا کھینچ کے لگایا گیا تھا۔ اس پر جگہ جگہ سفید آٹھ لائن سے کچھ پھول بنائے گئے تھے۔ وہ چھوٹا برش انگلیوں میں تھا میں احتیاط سے پھولوں میں رنگ بھر رہی تھی۔

فریم کے اس پارو ہی پٹھان بچھ بیٹھا تھا۔ چہرہ ہتھیلیوں میں گرائے وہ ناخوشی سے ریشم پر ابھرتے پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہر پھول کے آدھے حصے میں سفید رنگ بھرا تھا اور باقی آدھا خالی تھا۔

”یا چھے نہیں لگ رہے مالا باجی۔ کوئی مسئلہ ہے۔“

مالا نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا اور مسکرائی۔ ماتھے پہ سبز ریشمی روپاں باندھے وہ بالوں کو جوڑے میں لپیٹے ہوئے تھی۔ حسب معمول ایک گال پہ پینٹ کا دھبہ تھا اور انگلیاں بھی رنگیں ہو رہی تھیں۔

”رنگ سارے مسئلے حل کر سکتے ہیں، طوٹی۔“

اس نے دوسرا برش اٹھایا اور سرخ پینٹ میں ڈبو کے پھول کے خالی حصے کو بھرنا شروع کیا۔

اس پچے کا اصل نام نہ جانے کیا تھا لیکن وہ خود کو طوٹی خان کہتا تھا۔ اور اس وقت اس کی آنکھیں تھیر سے طوٹے کی طرح پھیل گئیں۔

”واہ۔“ سبز سازھی کے کپڑے پہ سرخ اور سفید پھول بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ (سرخ رنگ یاد رہ جانے والا رنگ ہے۔) وہ برش کو پھر سے سرخ رنگ سے رگڑ رہی تھی جب دور کہیں یا دوں میں سے ایک آواز ابھری۔ اس کے ہاتھ سے ہوئے۔ لیکن اس نے سر جھٹک دیا۔ اسے اب سر جھٹکنے کی عادت ہو چکی تھی۔

نئی ای میل کی ٹون نے اسے متوجہ کیا تو اس نے برش رکھا اور فون اٹھاتے ہوئے گال پہ آئی لٹ کان کے پیچھے اڑی۔ سرخ دھبہ کان کے قریب لگ گیا لیکن اسے پرواف نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں ای میل پڑھتے ہوئے بے یقینی اور خوشی سے چمکنے لگی تھیں۔

”مالا۔ تمہیں خالہ باری ہیں۔ کوئی بات کرنی ہے۔“ ماہی نے چوکھ میں آکے دروازہ بجايا تو اس نے خوشی سے تمبا تا چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

”مجھے دہنی میں جاب مل گئی ہے۔“ اس کے گال گامبی ہو رہے تھے۔ ایک دوست کے کزن کا ریسٹوران رینوویٹ ہو رہا ہے۔ میں ایک ماہ بعد جوائن کر سکتی ہوں۔“

”مبارک ہو۔“ ماہی سوق سوق کے کہنے لگی۔ ”لیکن اتنی جلدی؟ ابھی شادی بھی نہیں ہوئی اور جاب؟“ بچہ باری باری دونوں کے چہرے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

”میں شادی اسی لیے کر رہی ہوں تاکہ ایک نئے شہر میں نئی زندگی شروع کر سکوں۔ اور جاب اس زندگی میں میرے لیے بہت ضروری ہے۔ خالہ سے کہو میں آرہی ہوں۔“ وہ مطمئن تھی۔

نیچے آئی تو شر جہاں خالہ لاونچ میں ہی بیٹھی تھیں۔ وہ حور جہاں جیسی ہی دکھتی تھیں۔ سبز آنکھیں۔ سرخ و سفید

رُنگت۔ البتہ جسم متوازن تھا۔ موٹا پہنیں چڑھا تھا۔ امریکہ میں رہ کے خود کوفٹ اور جوان رکھے ہوئے تھیں۔ باب کٹ بالہیں بینڈ سے پیچھے کر کھے تھے۔

وہ بڑے صوفے کے ایک کنارے پہ بیٹھی تھیں۔ مالا آکے دوسرے کنارے پہ بیٹھی اور زمی سے پوچھنے لگی۔

”آپ نے بلا یا تھا خالہ؟“، شر جہاں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ سیاہ ٹراوَز اور لمبی قمیض پہ ڈھیلا ڈھالا کارڈیگن پہنے، جوڑا بنائے ماتھے پہ سبز رومال لپیٹے بیٹھی سادگی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ شر جہاں دو روز پہلے امریکہ سے آئی تھیں اور جیٹ لیگ کی وجہ سے زیادہ وقت آرام کرتی رہی تھیں۔ کھل کے بات کرنے کا موقع آج ملا تھا۔

”مالا تم اس رشتے سے خوش ہو؟“، انہوں نے الفاظ جوڑے۔ ماہی بھی خاموشی سے سامنے والے صوفے پہ آکے بیٹھ گئی۔

”ظاہر ہے میں خوش ہوں۔ کیوں؟“، اس نے چونک کے انہیں دیکھا۔ پھر ماہی کو۔

”مالا... بیٹھی... میرا نہیں خیال زیاد تمہارے لیے ایک اچھی چوائی ہے.....“، وہ اس کی طرف پہلو موڑ کے بیٹھیں۔ چہرے پر تفکر تھا۔ ان کی فیصلی ہم سے بہت مختلف ہے۔ اور یہ نگینہ...، ان کے لجھے میں ناپسندیدگی ابھر آئی۔ ”وہ مجھے کبھی بھی پسند نہیں رہی۔“، اس کے لجھے میں ناپسندیدگی ابھر آئی۔

ماہی نے گردن بالکل جھکا دی۔ وہ اس وقت مالا کوئی نئی اڑائی افسوس نہیں کر سکتی تھی۔

”نگینہ آنٹی بہت اچھی اور نیک خاتون ہیں۔“، اس کو بہت بر الگا جھٹکی کی طرح اپنے ہونے والے سرال کی برائی اسے اپنی برائی لگی تھی۔

”اللہ معاف کرے لیکن لوگ جیسے نظر آتے ہیں، ویسے ہوتے نہیں ہیں۔“، خالہ نے ناک سے کھی اڑائی۔

”نگینہ آنٹی آپ کو کیوں نہیں پسند؟“، وہ بغور خالہ کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

”کیونکہ وہ بہت چالاک عورت ہے۔ ہم ایک زمانے سے اس کو جانتے ہیں۔ وہ تمہاری ماں کو بھی پسند نہیں تھی۔“،

”نہیں تو۔ وہ اتنے مہینے سے ہمارے گھر آ جا رہی ہیں۔ ماں نے ہمیشہ ان کو ویکلم کیا ہے۔“، اس کا لجھہ دفاعی تھا۔

”نہیں مالا۔ خالہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ماں کو پہلے نگینہ آنٹی پسند نہیں تھیں۔ یہ تبدیلی عزہ کی شادی سے آئی ہے۔“، ماہی کھنکھاری۔

عزہ اس کی وہ کزن تھی جس کی شادی اٹینڈ کرنے وہ کیف کے ساتھ اسلام آباد سے لا ہور آئی تھی اور پھر لا ہور

سے نکل نہیں سکی۔ اسی شادی پہ وہ براہ راست پہلی دفعہ زیادا اور گنیز آٹھی سے ملی تھی۔ اس سے پہلے ماموں کے ٹیرس سے اس نے براوئی کھاتے ہوئے ان کو صرف دیکھا تھا۔  
ادھر ماہی کہہ رہی تھی۔

”عزم کی شادی پہ گنیز آٹھی ایک لمبے عرصے بعد ماں سے ملی تھیں اور انہوں نے سب کے سامنے کبیرہ تانی سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے ماں کا دل ان کی طرف سے نرم ہوا۔ اور پھر ماں برین ٹیومر کی مریضہ تھیں۔ ان کا دماغ ٹھیک سے فیصلے نہیں کر پا رہا تھا۔ ورنہ انہوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے ہمیشہ یہی بتایا تھا کہ انہیں گنیز آٹھی نہیں پسند۔“

”مجھے ایسا کچھ یاد نہیں۔“ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ گفتگو مشکل ہوتی جا رہی تھی۔  
”کیونکہ تمہاری ماں کی غیبت کی عادت نہیں تھی۔ اس کو کوئی پسند نہ ہوتا تو اس سے دور ہو جاتی تھی۔ خاموشی سے۔ تمہاری طرح۔“ خالہ نے بغور اسے دیکھا۔ اس کے اعصاب تن گئے تھے۔ اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”ویسے گنیز آٹھی ہیں تو اچھی ہی سوچ کے بولی۔“ ہماری ماں کو بہت سے لوگوں سے منسلک ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کوہ لوگ بڑے ہوں۔ گنیز آٹھی نے حور کو اتنا پیار کیا تھا، پھر اسے گھٹی بھی دی۔“  
”ہم گنیز آٹھی کو کیوں ڈسکس کر رہے ہیں؟ میری شادی زیادتے ہو رہی ہے۔“ اس نے زور دے کر یاد دلا یا۔  
”زیادا یک بہت عام سا انسان ہے، بیٹا۔ اس میں کوئی ایسے ہیرے نہیں جو کہ تم اس کے بارے میں سوچو بھی۔ اوپر سے اس کے ماں باپ کا عجیب ٹاکک سارشنا ہے۔ شادی سے پہلے ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ مرد کن حالات میں بڑا ہوا ہے۔ ٹاکک حالات میں بڑے ہونے والے مرد ٹاکک ہوتے ہیں۔ عباد کو دیکھو۔ اگر آن ج وہ ماہی کے ساتھا اچھا ہے تو اس لیے کہ اس کے گھر کا ماحول صحیح مند تھا۔“

”ہر انسان کے اندر بچپن کا ثراہما ہوتا ہے، خالہ۔ ہم بھی تو بغیر باپ کے بڑے ہوئے ہیں۔ کیا ہم ٹاکک ہیں؟ شادی کے بعد دو لوگ ایک دوسرے کی محرومیوں کو پورا کرتے ہیں۔ اس کے ماں باپ کی سزا اس کو کیوں دیں؟“ وہ سمجھنہیں پا رہی تھی۔

”بیٹے تمہیں زیاد سے اچھار شتمل سکتا ہے۔“

”اچھا... کون؟“ وہ چونکی۔ پہلی دفعہ اسے خالہ کی بات سمجھ میں آنے لگی۔

انہوں نے گھری سانس لی۔ چند لمحے کا وقفہ کیا۔ اب کے ماہی بھی چونکی۔ کچھ تھا جو وہ نہیں جانتی تھی۔

”میرے جیٹھ کا بیٹا ہے۔ فائق۔ عباد کا فرست کزن۔ امریکہ میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہے۔ اس کی ماں نے مجھے تمہارے لیے کہا ہے۔ وہ بہت اچھا، بہت قابلِ رُڑ کا ہے۔“

”فائق کی تو پچھلے سال ڈائیورس ہوئی ہے خالہ۔“ ماہی بے قینی سے بولی۔

”ڈائیورس کا کیا ہے۔ ہوتی رہتی ہیں۔ مرد پر کوئی دھبہ تھوڑی لگ جاتا ہے۔“ خالہ نے اسے گھورا۔

وہ اپنی جگہ بالکل شل ہو گئی۔ خالہ اس کو زیاد کے مقابلے میں ایک طلاق شدہ آدمی کا رشتہ قبول کرنے کے لیے کہہ رہی تھیں؟ وہ بھی اس کی شادی سے دس دن پہلے؟

”طلاق کو لوگوں نے taboo بنایا ہے۔ ایسی بڑی چیز نہیں ہوتی طلاق۔ ٹاکمک رشتے میں رہنے سے بہتر ہے بندہ طلاق لے کر اگل ہو جائے۔ اور فائق کی بیوی ہی کوئی سائیکلو تھی۔ شکر ہے اس نے جان چھڑا لی۔ وہ ہر لحاظ سے زیاد سے بہتر ہے۔ تم اس سے بات کر کے تو دیکھو۔“ خالہ اسے پھر سے سمجھا نے لگیں۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے لمب کھولے۔ بہت کچھ اندر ایک دم سے ابلنے لگا تھا۔ لیکن پھر... اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس ایک گھری سانس ناک سے اندر کھینچی اور بیوی سے خارج کر دی۔ سینے میں ابتلا اور اٹھندا ہو گیا۔

”میں جانتی ہوں کہ آپ میری بھلانی چاہتی ہیں، خالہ۔“ اس نے زمی سے ان کے ہاتھ تھامے۔ ”آپ سے پہلے مجھے کئی کمزز نے بھی بھی کہا ہے۔ کہ زیاد اور میرا جوڑ نہیں ہے۔ لیکن میرے نزدیک وہ ایک اچھا انسان ہے۔ پھر شادی ایسا جواہے جسے میں اپنی مرضی سے کھیلنا چاہتی ہوں۔ اگر زیاد ایک غلطی ہے تو یہ میری غلطی ہونی چاہیے۔ کسی انسان کی گارنٹی نہیں ہوتی۔ کوئی شادی کے بعد کچھ بھی نکل سکتا ہے۔“

”زندگی اتنی قیمتی ہے کہ اس میں تجربے نہیں کرنے چاہیں، مala۔“ خالہ نے افسوس سے اسے دیکھا۔

”میں نہیں سمجھتی کہ میں غلطی کر رہی ہوں۔ لیکن اگر آپ کو لگتا ہے کہ یہ ایک غلطی ہے تو کم از کم یہ میری غلطی ہو گی۔“ اس نے اسی زمی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے علیحدہ کر لیا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ خالہ یا سیت سے اسے دیکھے گئیں۔

”ماں گلیزہ آنٹی کو کیوں پسند نہیں کرتی تھیں؟“ مala کے جانے کے بعد ماہی سوق میں گم بولی۔

”کیونکہ تمہاری ماں اللہ کا بہت ذکر کرتی تھی۔ اور جو بہت ذکر کرنے والے لوگ ہوتے ہیں نا، انہیں اشارے مل جاتے ہیں۔ انگریزی میں جسے تم vibes کہتی ہو۔“ پھر کچھ یاد آنے پنگلی سے ماہی کو گھورا۔

”اور تم نے بھی پکڑ کے اتنی عورت سے بیٹی کو گھٹی دلوادی۔“

”وہ... انہوں نے خود کہا تھا۔“ وہ گڑ بڑا کے کھڑی ہوئی۔

حور کا فیڈر لینے والے کچھ تک آئی تو دیکھا، کاؤنٹر پر زیاد کی لائی چالیس کا ایک بس ادھ کھلا رکھا تھا۔ ذہن میں ماہر کا کہا فقرہ گونجا لیکن اس نے سر جھکا اور ایک چالکیٹ نکال کر ریبرا تار نے لگی۔

”خواخوا جیلس ہے وہ۔ ہونہہ۔“ ریپرڈ سٹ بن میں اچھا لاؤر چاکلیٹ منہ میں رکھتی وہ آگے بڑھ گئی۔

A horizontal row of twelve empty star-shaped input fields, intended for the student to type their answers.

”کیف“ کی بالائی منزل پہ بنے آفس کی بن اس صحیح خالی تھے کیونکہ سارا عملہ لفت کے سامنے ہجوم کی صورت کھڑا تھا۔ اشتیاق بھری نظریں دھاتی دروازوں پہ جھی تھیں۔ اسی لمحے لفت کی گھنٹی بجی۔ دروازے الگ ہوئے اور ماہر فریض نظر آیا۔

سیاہ سوت کے اندر سفید شرت پہنئے، گلے بال پچھے کو جمائے وہ دیساہی تھا۔ سوائے رخسار پر لگے زخم کے نشان کے۔ پا پھر کہنی کے ساتھ لگی بیساکھیوں کے۔

”خوش آمدید ماہر بے۔“ پر جو ش انتقال آفس واپسی کی مبارک صحت یا بی کی دعائیں۔ ایک ساتھ بہت کچھ اس کی طرف آیا۔ ماہر نے بدقت مسکرا کے سرگوہم ولیا۔ پھر نگاہ میں کچھ اٹکا۔ مین ہال کی دیوار کے ساتھ پھولوں کی بجاوٹ کی گئی تھی۔ ساتھ ہی کچھ سوئیٹس رکھی تھیں۔

”یہ سب کس نے کیا ہے؟“ اس نے شبنم کی طرف دیکھا جو سب سے آگے تھی لمسکر اکے سینے پہ ہاتھ رکھا۔

”گذ۔ یہ فضول خرچی تمہاری تنخواہ سے کٹے گی۔“ ایک بڑا نظر اس پر ڈال کے وہ بیساکھی کے سہارے آگے پڑھا۔

”اور آپ سب ایسی نشتوں پہ جائیں۔ آپ کو کمپنی اس وقت کے لیے یہ کرتی ہے۔“

وہ سب مسکرا ہیں دبائے ادھر ادھر بکھر گئے۔ درمیان میں راستہ چھوڑ دیا۔ وہ آگے بڑھا اور شبنم مسکرا کے اسے آفس تک حاتے دیکھتی رہی۔ جب وہ اندر چلا گیا تو وہ اسٹاف کی طرف پلٹی اور ہتھیلی پھیلایا۔

”میں شرط جیت گئی۔ ماہربے کو ایک سیڈنٹ بھی مشین سے انسان نہیں بناسکا۔ میرے پیسے!“، مسکرا کے آنکھیں گھما کیں۔ اور بہت سے ہاتھے اختیار جیبوں کی طرف بڑھ گئے۔

وہ آفس میں داخل ہوا تو زار اپہلے سے اندر موجود تھی۔ وزیر چیز پہ بیٹھی وہ اسی کی منتظر تھی۔

”کیا تمہیں اتنی جلدی آفس جوان کرنا چاہیے تھا؟“ وہ خفگی سے کہتی کھڑی ہوئی۔ ماہر نے جواب نہیں دیا۔ وہ بیساکھی سے لنگڑا کے چلتا کنسول ٹیبل تک آیا جو کہ کھڑکی کے قریب تھی۔ کھڑکی میں رکھا کیکش کا پودا سو کھڑ چکا تھا۔ ماہر نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ سر جھانے دراز کھول رہا تھا۔ بیساکھی پر گرفت ڈھیلی ہوئی تو وہ پھسل کے نیچے جا گری۔

”مجھے میرا جواب مل گیا ہے۔“ وہ قریب آئی اور جھک کے بیساکھی اٹھائی۔ پھر سیدھے ہوتے ہوئے ناراضی سے اسی دیکھا۔

”تم ورک فرام ہوم بھی کر سکتے تھے۔ میں تمہیں ہر چیز گھر پہ مہیا کر دیتی۔“

”اور ڈوپا میں؟ اس کا کیا؟“ وہ مسکرا کے دراز سے لائٹر نکال رہا تھا۔ زار اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”جو ڈو ماپین رش مجھے چاہیے وہ گھر بیٹھنے نہیں مل سکتا۔“ اس نے لائٹر جایا اور قطار میں رکھی کینڈلز میں سے ایک کا ڈھکن اٹھایا۔ صندل و ڈ۔

”(ڈو ماپین انسانی دماغ میں پیدا ہونے والا ایک کیمیکل ہے جو انسان کو اچھا محسوس کرواتا ہے۔ اور اپنے پسندیدہ کاموں کے درمیان میں ریلیز ہوتا ہے۔) لائٹر کے شعلے نے مومن بنتی کے دھاگے کو چھو اور اس نے آگ پکڑ لی۔ پل بھر میں مومن گپھلنے لگی۔

”تم ہمارے بارے میں سوچتے ہو کجھی؟“

وہ میز تک آ رہا تھا جب زار ادھیرے سے بولی۔ وہ چونکا۔ بیساکھیاں کوٹ اسٹینڈ کے ساتھ رکھیں (ایک پھر سے پھسل گئی) اور ناسجھی سے اسے دیکھا۔

وہ ابھی تک دور کنسول ٹیبل کے ساتھ کھڑی تھی۔ بل دار بال دونوں شانوں پر گر رہے تھے۔ براق سفید مڈی ڈر لیس میں ملبوس، گریبان پر جھولتی سنہری زنجیریں، ناخنوں پر فیروزی نیل پاش اور سفید لانگ بوٹس پہنے، وہ بظاہر ہمیشہ جیسی ہی تھی لیکن کچھ تھا جو بدلا ہوا لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ملال تھا۔ یا شاید گلہ۔ وہ فیصلہ نہیں کر سکا۔

”کیا مطلب؟“

”کبھی تم ہمارے بارے میں سوچتے ہو ماہر؟“ وہ قدم قدم چلتی آگے آ رہی تھی۔ صندل و ڈ کی خوبصوروم کی قید سے آزاد ہو کے سارے میں پھیلنے لگی۔ وہ ٹیک لگائے، آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے غور سے اسے دیکھے گیا۔

”میں جو لندن سے آئی ہوں اس کمپنی کے لیے۔ اور یہ لوگ جو (دروازے کی طرف اشارہ کیا) دن رات اس کمپنی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اگر کیف ڈوباتو ہم سب کے کیریئر زکا کیا بنے گا؟“

”تم کافی دن سے مجھے اپ سیٹ لگ رہی ہو۔ کیا ہوا ہے؟“ وہ قدرے حیران تھا۔

”کیونکہ تم اس کمپنی کو وقت نہیں دے رہے۔“

”وقت دینے ہی آفس آیا ہوں۔ اور...“ وہ متعجب ہوا۔ ”ابھی تم کہہ رہی تھیں مجھے گھر پہ ہونا چاہیے تھا۔“

”تم کیف پہ کام کرنے آفس نہیں آئے۔ مجھ سے یہ پوچھنے آئے ہو کہ مجھے زیاد سلطان کی بینک اسٹینٹ میں کیا ملا؟“

وہ میز کے کناروں پہ ہاتھ رکھ کھڑی بہت بے بسی بھری برہمی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ماہر نے ”اوہ“ کہ کے ایک گھری سانس خارج کی۔

”کیا ملا؟“ مسکرا کے سامنے رکھا لیپ ٹاپ کھولا۔ دوسرا ہاتھ بڑھا کے ڈیکٹ ٹاپ آن کیا۔ بیک وقت بہت سی اسکرینز جل اٹھیں۔

”تمہیں اپنے اس جنون کے علاوہ کسی کی فکر نہیں ہے، ماہر۔“

”وہ جنون نہیں ہے۔ وہ میری بہن ہے۔“ وہ ایک دم درشتی سے بولا۔ مسکرا ہٹ غائب ہوئی اور ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

”وہ بہن جو مرچکی ہے۔ اس کی تاش میں ہم سب تمہارے آلہ کار بننے ہوئے ہیں۔ رہی زارا تو زارا کا کیا۔ زارا اسی چیز میں تو اچھی ہے۔ ایک کال کرو اور زارا کام کر دے گی۔ فلاں کا پتہ کرواؤ۔ فلاں کی بینک اسٹینٹ نکلواؤ۔“ اس کی آواز بھیگنے لگی۔

”تمہیں آلہ کار بننے سے منع کر دینا چاہیے تھا۔ میں کسی اور سے کہہ دیتا۔“ وہ بے نیازی سے اب کی بورڈ پہ انگلیاں چلا رہا تھا۔ اسکرین کی نیلی روشنی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔

”باباٹھیک کہتے ہیں۔ تمہیں میری پرواہ نہیں ہے۔“

”زارا کیوں صحیح مجھ سے لٹر رہی ہو؟“ اس نے کراہ کے اسکرین فولڈ کی۔ پھر بے بسی سے اسے دیکھا۔ سر میں درد ہونے لگا تھا۔

”تم میں اور کبیرہ ساداں میں کوئی فرق نہیں ہے۔“ وہ افسوس سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ماہر فرید کے چہرے پہ ناگواری بکھری۔ جیسے کچھ کڑوا مشروب پی لیا ہو۔

”مجھے اس سے کیوں ملارہی ہو؟“

”کیونکہ اتنی سے سب شروع ہوا تھا۔ تم نے اس کے بارے میں مجھے معلومات لینے کے لیے کہا۔ اور میں نے تمہاری مدد کر کے تمہیں مزید اس جنون کی دلدل میں دھکیل دیا۔ اسی کی وجہ سے تم بار بار لاہور جاتے ہو۔ اور تمہارے ساتھ یہ سب (بیساکھی کی طرف اشارہ کیا) ہورہا ہے۔“

”زارینہ فرید....“، اس نے آنکھیں بند کر کے کنپٹیوں کو سہلا کیا۔ ”میں کبیرہ کے لیے لاہور نہیں جاتا۔ میں اس کے بارے میں صرف اس لیے جاننا چاہتا تھا تاکہ دیکھ سکوں کہ اس کے اور میرے خاندان کے درمیان کوئی مشترک کڑی ہے یا نہیں۔ اور یقین کرو ہمارے درمیان کچھ مشترک نہیں ہے۔ میں اپنے جس دشمن کو ڈھونڈ رہا تھا، اس کا کبیرہ سے تعلق نہیں ہے۔“

”جھوٹ مت بولو۔ تم میں اور اس عورت میں بہت کچھ مشترک ہے۔ لیکن خیر... مجھے کیا۔“، اس نے میز پر رکھے کاغذات کا ایک پلنڈہ اس کی طرف دھکیلا۔

”زیاد سلطان کی بینک ایشمنٹس رہت پوچھنا کہ مجھے کیسے ملیں۔ بہت وقت لگا۔ لیکن مل گئیں۔“، ”لہجہ جاتا ہوا تھا۔“ اور ان میں ایسا کچھ نہیں ہے جو مسئلکوں ہو۔ وہ کسی کو ایک مخصوص رقم نہیں بھیجتا۔ بلکہ وہ زیادہ پیسے خرچ نہیں کرتا۔ کنجوس ہے۔“

ماہر نے تیزی سے پلنڈہ اٹھایا اور نگاہ پہلے صفحے پہ دوڑائی۔

”کوئی بڑی رقم جو اس نے نکلوائی ہو؟“، وہ صفحات پلٹا رہا تھا۔ زارا نے افسوس سے اسے دیکھا۔

”کہا۔ کنجوس ہے۔ زیادہ پیسے خرچ نہیں کرتا۔“

”یا ایک کاؤنٹ سے اسے ہر ماہ ایک بڑی رقم بھیجی جا رہی ہے۔“، اس نے پین سے ایک جگہ اشارہ کیا۔

”یہ اس کی ماں کا کاؤنٹ ہے۔ ماماز بوائے۔ ابھی تک اپنی ماں سے خرچ لیتا ہے۔“، زارا نے کندھے اچکائے۔ وہ ابھی تک خفا خفاسی تھی لیکن وہ جیسے ایشمنٹ کی طرف متوجہ تھا۔

”بہت پیسے ہے اس کی ماں کے پاس۔“، وہ بڑا بڑا یا۔ یونہی چہرہ اٹھا کے کچھ سوچنے لگا۔ نگاہیں کنسول ٹیبل پہ جلتی صندل و ڈکی موم ہتی پہ جبی تھیں۔

”کیا ہوا؟“

”اس کی ماں...“ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ ”اس کی ماں سے میں ملا تھا۔ کب؟“ اور اگلے ہی لمحے سے یاد آیا۔ وہ باہر لان میں تھا۔ وہ دن جب وہ کشمکش میں کی نوکری چھوڑ رہا تھا۔ وہ اسے کھڑکی سے اندر پہنچی دکھائی دی تھیں۔ سفید دوپٹے والی باوقار سی عورت۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ پھر انہوں نے اسے بلا یا تھا۔ کیوں؟ کچھ منگوایا تھا انہوں نے۔ ہاں۔ اسے یاد آیا۔ جائے نماز۔ وہ جائے نماز لے کر اندر آیا۔ انہوں نے شکریہ کہا۔ اس نے جائے نماز ساتھ رکھی۔ اور واپس مڑا۔ انہوں نے اسی وقت جائے نماز اٹھائی۔ ان کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکرا یا تھا۔ ہلاکا سالمس۔ جیسے راہ چلتے بہت سے لوگوں کے ہاتھ نکلا جاتے ہیں۔ اور وہ باہر نکل آیا تھا۔ وہ زیادا اور ملا کے رشتے کی بات کر رہی تھیں۔ اور اس کے دل پر جیسے گھونسا سا گا تھا۔ اسے وہ گھونسا بھی تک یاد تھا۔ جیسے کوئی جسمانی تکلیف ہو۔ اسی رات وہ اپارٹمنٹ جا کے شدید بخار میں مبتلا ہو گیا تھا۔

”اس کی ماں کے پاس زمینوں سے ٹھیکوں کی آمد نی آتی ہے۔ کہو تو اس کو چیک کروں؟“ وہ قدرے طنز سے بولی۔ ماہر فرید نے سر جھکا۔

”اوہ انہوں۔ اس کی ماں بے ضرر سی گھر بیلو عورت ہے۔ رہنے دو۔“ وہ اسٹیٹمنٹ کے صفحے پلٹار ہاتھا۔ اسے جیسے شدید مایوسی ہوئی تھی۔

”آخر زیاد کیسے سرکار کی فیس ادا کرتا ہوگا؟ کوئی عدالت ہونا چاہیے تھا، نمبر زکبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ شاید وہ کسی اور صورت میں پے منٹ کرتا ہو۔“ وہ خود سے بڑا بڑا ہاتھا۔ سراخ ملایا تو دیکھا، وہ ابھی تک خفاظت آرہی تھی۔ ماہر کی پیشانی کے بلڈھیلے ہوئے۔

”زارا...“ وہ نرمی سے گویا ہوا۔ ”میں نے تمہیں کبھی اس شہر میں آنے کے لیے مجبور نہیں کیا تھا۔ تم جب بھی واپس جانا چاہو جاسکتی ہو۔ میں اتنا خود غرض نہیں ہوں کہ اپنی نئی کمپنی کی وجہ سے تمہارے کیریئر کے اہم سال ضائع کرواؤ۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ میں کسی کو بھی نہیں روکا کرتا۔“

”اور یہی تمہارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ تم کسی کو نہیں روکتے۔ اور اسی وجہ سے ایک دن تم اکیلے رہ جاؤ گے۔“ وہ جیسے ایک دم پھٹ پڑی۔ پھر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

کاغذ اس کے ہاتھ میں رہ گئے۔ وہ جہاں بیٹھا تھا، وہیں سن ہو گیا۔

زارا کی چند لمحے پہلے کہی بات نے ایک دم اسے جھنجھوڑ دیا تھا۔

وہ درست کہہ رہی تھی۔ اسے پہلے کیوں اندازہ نہیں ہوا؟

اس نے کاغذات کا پلندہ پرے کیا اور تیزی سے انٹر کام کا ریسور اٹھایا۔

”شنبم... مجھے ایک کیر گیکر چاہیے۔ پوفیشل نر۔“



اس صحیح اپنے کمرے سے نکلنے سے پہلے کشمائل بین نے مسکرا کے آئینے پہ چپاں فہرست کی ایک سطر کاٹی تھی۔  
ویڈنگ رنگ کی خریداری۔

جیولرز کی سفید محل جیسی عمارت سڑک پر دور سے ممتاز دکھائی دے رہی تھی۔ سامنے پارکنگ لائٹ تھا جس کے اندر کار کھڑی کر کے وہ چند منٹ سے داخلی دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ بار بار کلامی پہ بندھی گھڑی دیکھتی۔ وہندہ اور سردی بڑھ گئی تھی۔ وہ سادہ سبز لباس پہ بھوری لیدر جیکٹ پہنے کھڑی، ہاتھوں کو آپس میں رگڑ رہی تھی۔ تمیض کے گریبان پہ فاختہہ والا کٹ جگہ گارہاتھا۔ کھلے بال ٹھنڈی ہوا سے پچھے کواڑ رہے تھے اور متلاشی نظریں پارکنگ لائٹ پہ جھی تھیں۔

تب ہی وہ اسے نظر آیا۔ چہلے پہ مسکراہٹ در آئی۔

”میں لیٹ ہو گیا۔“ زیاد سلطان مکملاتے ہوئے اس کی طرف آرہا تھا۔ خالہ کی باتیں اور سارے خدشے ہوا ہونے لگے۔

”نہیں۔ مجھے جلدی پہنچنے کی عادت ہے۔“ کہتے ہوئے ابوں کے دھواں سانکلا۔

”ویڈنگ رنگ آپ اپنی پسند سے بھی لے سکتے تھے۔“

وہ دونوں عمارت میں ساتھ ساتھ داخل ہوئے۔

”آپ کا تھا۔ آپ کی پسند۔“ وہ مسکرا کے بولا۔ ٹھیل نیک سوئیٹر کے اوپر اس نے کوٹ پہن رکھا تھا جو سامنے سے کھلا تھا۔ وہ اسے آج بھی ہمیشہ کی طرح اچھا ہی لگا تھا۔

”آپ کے بال بہت خوبصورت ہیں۔“ آگے بڑھتے ہوئے اس نے چہرہ اس کی طرف جھکا کے دھیرے سے کہا۔ ”لیکن مجھے زیادہ خوبصورت تب لگتے ہیں جب آپ اوپنجی پونی بناتی ہیں۔“

وہ ہلکا ساہنس دی۔ ”وہ تو محض کام کرتے ہوئے بناتی ہوں۔ ورنہ مجھے اوپنجی پونی نہیں پسند۔“

جیولرز کی عمارت اندر سے روشنیوں سے منور تھی۔ ٹالوز سے تجھی دیواریں سیاہ اور سنہرے رنگ کے امتزاج کا ڈیکور باؤردی سیلز میں، عود کی خوبیوں۔ ہرشے اعصاب پر رعب طاری کرتی تھی۔

”بھیلو کشمالة میم۔“

”میم بہت عرصے بعد آئیں۔“

اسے ہر طرف سے سلام کیا جا رہا تھا۔ بوڑھا چوکیدار، دیکم ڈیک پہ بیٹھی لڑکی، سیلز مین، سب کے سر جھکا کے استقبال کرنے کے انداز میں شناسائی تھی۔ وہ مسکرا کے سب کو سر کے خم سے جواب دے رہی تھی۔

زیاد سامنے ہال کی طرف بڑھنے لگا جہاں طویل شوکیسز بننے تھے لیکن اس نے روک دیا۔

”یہ گولڈ سیکشن ہے۔ ہم اور ڈائمنڈ سیکشن میں جائیں گے۔“ وہ مسکرا کے لفت کی طرف بڑھ گئی۔ زیاد کی مسکرا ہٹ قدرے پھیکی ہوئی۔ البتہ سر ہلا دیا اور اس کے پیچھے ہو لیا۔

”آپ ان کی پرانی کلائنٹ ہیں غالباً۔“ گردن گھما کے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے وہ سرسری سایپا۔ جیسے بالکل بھی متاثر نہ ہوا ہو۔

”کہتے ہیں کسی کے خاندانی ہونے کا پتہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا ملازم اور اس کا جیولر کتنا پرانا ہے۔“ کشمالة مبین نے مسکرا کے کندھے اچکا دیے۔ لفت کے دروازے کھلے تو وہ اسی اعتماد سے آگے بڑھ گئی۔ اسے معلوم تھا اسے کہاں جانا ہے۔ جو اس کے چہرے پہ پھیلا غیر آرام وہ ساتھ نہیں دیکھ سکی تھی۔

بالائی منزل سلوار اور نیلے رنگ سے تھی تھی۔ یہاں ہر طرف ہیرے کے زیورات شوکیسز میں دکھائی دے رہے تھے۔ ہال کے وسط میں نیلے مخلیں صوفوں سے بنا ایک سٹنگ ایریا تھا وہ دوسرے کشمرز کی طرح شوکیسز کی طرف نہیں گئی۔ سیدھا سٹنگ ایریا تک آئی اور ایک صوفے پہ بیٹھ کے ٹانگ پہ ٹانگ جاتا۔ شوکیسز کے پیچھے ایک سینٹر جیولر ایک کشمرز کو کچھ دکھار ہے تھے۔ اس پر نظر پڑی تو مسکرا کے سر کو خم دیا۔ پھر اپنے کشمرز کو دوسرے جیولر کے حوالے کر کے شانتگی سے مادرت کرتے ہوئے وہاں سے اٹھا آئے۔

”کشمالة جی۔ کیسی ہیں آپ؟“

وہ ان کے سامنے والے صوفے پہ آ بیٹھے۔ وہ پر سکون نظر آ رہی تھی۔ البتہ زیاد قدرے تکلف سے بیٹھا تھا۔ نگاہیں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”آپ کی والدہ کا بہت افسوس ہوا۔“ جیولر اس سے تعزیت کر رہے تھے۔ مالا نے تھوڑی قدرے جھکا دی۔ اس ذکر سے ملنے والی تکلیف کبھی پرانی نہیں ہو سکتی تھی۔

”بہت نیک خاتون تھیں۔ بہت اچھی۔ جب بھی آپ کے ساتھ آئیں، ایک خوشگوار تاثر چھوڑ کے گئیں۔ ان کی

موت پر ایک دنیاروئی ہوگی۔“

زیاد سلطان کے چہرے پر سے سایہ سا گزرا۔ اس نے ٹائی ڈھیل کرنے کے لیے گردن کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن احساس ہوا کہ بنا ٹائی کے ہی گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔

”آپ اپنے ڈائمنڈز میں سے خریدتی ہیں؟“ اس نے مداخلت کی۔ وہ جو تعریت کے جواب میں ماں کے لیے کچھ کہنے والی تھی، زیاد کو دیکھ کے جواب دینے لگی۔

”جی۔ کیونکہ ڈائمنڈ جیولری ایک اچھی انویسٹمنٹ ہوتی ہے اگر جیولر اچھا ہو۔ یہی ڈائمنڈز امریکہ اور کینیڈا سے آدمی قیمت پر سیل میں بھی مل جاتے ہیں لیکن میں ان کو پہنچنیں سکتی۔ اس کے عکس، لاہور کے تمام بڑے جیولرز ڈائمنڈ جیولری ایک سال بعد اسی قیمت پر واپس لے لیتے ہیں یا ہم اس کی جگہ کچھ اور خرید سکتے ہیں۔ جب دل بھر گیا تو واپس کر کے کچھ اور لے لیا۔“

”امریکہ کینیڈا کے سیل والے ڈائمنڈز کا ذکر نہ ہی کریں۔“ سوٹ میں ملبوس سینٹر جیولر نے منہ بنا یا۔ ”ان کو اس کے نیچے رکھو (ایک عدسہ اٹھا کے اہر ایا) تو دوبارہ دیکھنے کا جی نہیں کرتا۔ خیر... کیا دیکھنا چاہیں گی آپ؟“ نگاہیں گھما کے باری باری دونوں گود دیکھا۔ ایک تکنلت سے بیٹھی سبز آنکھوں والی لڑکی جس کے لبے بال چہرے کے دونوں اطراف میں گر رہے تھے، اور ساتھ غیر آرام وہ سماں بیٹھا بے کشش چہرے والا نوجوان۔

”ویڈنگ رنگ۔“ وہ کھنکھارا۔ ایک ملازم ان کے سامنے بھاپ اڑاتے کافی کپ رکھ رہا تھا۔ کشمائلہ نے شاشتگی سے معدرست کر لی۔

”میں باہر کسی کو کافی کا کہہ آئی ہوں۔ تھیں لکس۔“

”ون کیرٹ؟ ٹو کیرٹ؟“ جیولر کی بظاہر مسکراتی لیکن اندر تک ایکس رے کرتی نظریں زیاد سلطان پر جھی تھیں۔

”جو بہترین ہو۔“ زیاد نے جو لامسکرا کے مala کی طرف دیکھا۔ اس کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔ ”بہترین۔ او کے۔“

تحوڑی دیر بعد نیلے محل کے ڈسپلے کیس ان کے سامنے میز پر رکھے تھے جن میں درجنوں انگوٹھیاں جگہ گارہی تھیں۔ چھت پر نصب روشنیوں نے ہیروں کی چمک کوئی گناہ بڑھا دیا تھا۔ زیاد نے دیکھا، مala کے ہاتھوں میں پہلے سے چار انگوٹھیاں، کانوں میں ڈائمنڈ ٹاپس اور کلاں میں ہیروں سے جگلگا تانا زک سا بریسلیٹ موجود تھا۔ ان سب

کی چمک اسے مزید غیر آرام د کر رہی تھی۔

”ویڈنگ رنگ صرف ایک solitaire کی ہونی چاہیے۔ اس کیس میں صرف سولیٹری ہیں۔ اور یہ آپ کو پسند آئے گا۔“

جیولر نے ایک انگوٹھی اٹھائی اور اس کی طرف بڑھائی۔

”ون کیرٹ۔ بلیوڈ ائمنڈ۔ یہ ابھی حال ہی میں امپورٹ میں آیا ہے۔“

ان دونوں کی نگاہیں اس کی طرف بلند ہوئیں۔ وہ ایک نیلی چمک والا چوکر solitaire تھا جو انگوٹھی میں مرصع تھا۔

”بہت خوبصورت۔“ وہ زیر لب بر بڑائی۔

”کیا قیمت ہو گی اس کی؟“ زیاد انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا۔

”آپ کے لیے...“ جیولر نے کیلکو لیٹر اٹھایا۔ چند کیز دبا کیں۔ پھر سراٹھا کے عام سے انداز میں بولا۔

”گیارہ لاکھ۔ اور یہ تھرٹی پرسنٹ ڈسکاؤنٹ کے بعد کی قیمت ہے۔“

زیاد سلطان کے ابر و استحباب سے اٹھ گئے۔ البتہ وہ بہکا سانپس دی۔

”یہ بہترین ہے، تنوری بھائی۔ لیکن مجھے بہترین نہیں چاہیے۔ ایسی انگوٹھی کی توقع میں اپنے فیانسی سے نہیں کرتی۔ اپنی کمائی سے کرتی ہوں۔ اب آپ مجھے وہ دکھائیں جو مجھے پسند آئے گا۔“

جیولر مسکرا کے اب اس کو کچھ دوسرا انگوٹھیاں دکھار رہا تھا۔ گاہے بگاہے ہے کنکھیوں سے وہ زیاد کو بھی دیکھ لیتا جو ہنوز اسی چوکر ہیرے والی انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا۔

”وہ بہترین تھی۔“ زیاد سرگوشی میں بولا۔

”نہیں۔ وہ بہت مہنگی ہے۔ گیارہ لاکھ میں ہم نہیں مون ٹرپ پلان کر سکتے ہیں۔“

مالا نے ایک انگوٹھی ڈسپلے کیس سے نکالی اور انگلی میں پہن کے ہاتھ اور نچا اٹھا کے دیکھا۔

اس کے وسط میں ایک سادہ سفید موتنی لگا تھا۔ اور داکیں باکیں دو نئے نئے ہیرے۔

”یہ کیسی ہے؟“ وہ قدرے پر جوش سی ہوئی۔

”یہ موتنی ہے۔“

”مجھے دکھاوے کے لیے ایک کیرٹ نہیں لیتا۔ وہ لیتا ہے جو منفرد اور خوبصورت ہو۔ آرٹسٹک ہو۔ ایسا ذیزائن جو

گفتگو کرتا ہو۔“

”نہیں۔ امی کو اچھا نہیں لگے گا اگر میں آپ کو موتی کی رنگ دوں۔“ اس نے نفی میں سر ہلا کیا اور جیولر کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ خاموش ہو گئی۔

”میں امی کے ساتھ دو بارہ آؤں گا اور ہم وہی بہترین والا دن کیرٹ خریدیں گے۔“  
جیولر نے مسکرا کے سر کو اثبات میں ہلا کیا۔

”ویسے آپ کے ڈائمنڈ زاصلی ہوتے ہیں نا؟ یونو... پاکستان میں کسی چیز کا بھروسہ نہیں ہوتا۔“

وہ جوموتی والی انگوٹھی واپس رکھ رہی تھی، چونک کے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی ٹون میں ہلاکا ساطر تھا۔

”ڈونٹ وری۔ آپ کو ڈائمنڈ کا GIA سٹیفیکیٹ ساتھ ملے گا۔ یوں سمجھ لیں کہ ہر ڈائمنڈ کے اوپر لیزر کی مدد سے اس کا نمبر لکھا ہوتا ہے۔ آپ اس ڈائمنڈ کو دنیا میں کہیں بھی لے جا کے چیک کرو سکتے ہیں۔“  
زیاد سلطان نے ہلکے سے شانے اچکا دیے۔ کہا کچھ نہیں۔ کچھ تھا جو کشماہہ میں کو غیر آرام دہ کرنے لگا۔

”وہ بہت مہنگی ہے، زیاد۔“

”شادی ایک ہی دفعہ ہوتی ہے، اور شادی کا تھفا ایک ہی دفعہ دیا جاتا ہے۔“ وہ دونوں لفت کی طرف جا رہے تھے اور ان کی سر گوشیاں جیولر صاحب یہاں سے سن سکتے تھے۔ جو نیز جیولر اب ڈپلے باکسر اٹھا رہا تھا۔ دفعتاً ٹھہر کے کہنے لگا۔

”سراں چوکو ڈائمنڈ کا سائز عبدالباری بھی پوچھ رہی تھیں۔ ان کو کیا کہوں؟“  
”یہی کہ دستیاب ہے۔“ وہ ان کو لفت کے اندر جاتے دیکھ رہے تھے۔

”لیکن زیاد صاحب اسے خریدنے کا کہہ رہے تھے۔“

”بیٹھے...“ انہوں نے اس کے کندھے کو ہلاکا ساتھ پکا۔ ”ڈائمنڈ خریدنے والے ڈائمنڈ خرید کے ہی جاتے ہیں۔“  
وہ دونوں باہر نکلتے تو آسمان پہ بلکل سی دھوپ نکلی تھی۔ دھنڈ قدرے کم محسوس ہو رہی تھی۔

”ہم امی کو شادی کی شاپنگ میں شامل نہیں کر سکے۔ اس لیے سوچا کہ انگوٹھی انہی کے ساتھ خرید لوں۔“ وہ پارکنگ ایریا کی طرف جاتے ہوئے وضاحت کر رہا تھا۔

”شیور۔ جیسے آپ کو بہتر لگے۔ کیسی طبیعت ہے ان کی؟“

زیاد نے گردن جھکا دی۔ ”وہ ٹھیک نہیں ہیں۔“ گھسن پھر سے بڑھنے لگی تھی۔

”میں بہت دعا کرتی ہوں ان کے لیے۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ وہ جو بھاگ کہنے لگا جب....

”مالا باجی۔“

زیاد سلطان چونک کے گھوما۔ سامنے پارکنگ لائن میں ایک پٹھان بچہ بھاگتا ہوا آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کافی کاڈ سپوز بیبل گاس تھا۔ زیاد نے ناٹھجی سے اسے دیکھا۔

”زیاد... یہ طوٹی ہے۔ میرا بہت اچھا ہیلپر۔“ اس نے مسکرا کے کافی اس کے ہاتھ سے لی اور پیار سے اس کے بال بکھیرے۔ ”اس نے شادی کی بہت سی شاپنگ میرے ساتھ کروائی ہے۔ آتے ہوئے میں اسے ایک فرینڈ کے ریستوران میں چھوڑ آئی تھی جہاں یہ میری مرضی کی کافی بخار رہا تھا۔ اور ہاں یہ میری ایک ساڑھی بھی میرے ساتھ پینٹ کروار رہا ہے۔“

طوٹی جھینپ کے مسکرا دیا اور گردن اوپنجی کر کے دراز قد سے زیاد کو دیکھا۔ وہ اتنا پر جوش دکھائی نہیں دیتا تھا۔

”یہ وہ چاکلٹیس والے زیاد بھائی ہیں نا؟“

”چاکلٹیس؟“ زیاد چونکا۔ وہ تینوں پارکنگ ایریا میں دم توڑتی دھند کے درمیان کھڑے تھے۔

”ہاں جی۔ آپ کی لائی ساری چاکلٹیس میں ہی قوکھاتا ہوں۔“ طوٹی نے دانت نکالے۔ ملا دھیرے سے ہنس دی۔

”کیا مطلب؟“ وہ مسکرا نہیں سکا۔ سانس تک رک گیا۔

”میں چاکلٹیس نہیں کھاتی نا۔ تو آپ کی چاکلٹیس یہی کھاتا ہے۔ یا اس کے بھائی۔ اور بدلتے میں اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ یہ دوبارہ اسکول جانا شروع کرے گا۔“ وہ بنس کے بولی۔ پھر زیاد کا چہرہ دیکھا۔ کچھ تھا اس کے چہرے پر جو کشمالة بین کی مسکرا ہٹ پھیکی ہوئی۔ اس نے کافی طوٹی کو تھامی اور اسے کار میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ سر ہلا کے کار کی طرف بھاگ گیا۔

”کیا ہوا، زیاد؟“

”لیعنی وہ تحفہ جو میں آپ کے لیے لاتا ہوں وہ آپ اس... اس بچے کو دے دیتی ہیں؟“ بازو لمبا کر کے اس طرف اشارہ کیا جہاں کار کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا اور ماتھے پر لکیریں تھیں۔

”میں چاکلٹیس نہیں کھاتی۔ اس لیے...“

”آپ کے نزدیک میرے تھنے کی یہ قدر ہے؟ پسند نہیں آیا تو خیرات کر دیا؟ ہیرے کی انگوٹھی پسند نہ آئی تو اسی کو دے دیجئے گا۔“

بے بسی بھرے غصے سے اس کی آواز اوپر جو ہو گئی۔

وہ چند لمحے کے لیے جیسے ششد رہ گئی۔ گھڑیاں نے بارہ بجادیے تھے اور فیری ٹیل جیسے ٹوٹنے کو تھی۔

”زیاد آپ کو معلوم ہے کہ میں میٹھا نہیں کھاتی۔ سوائے چالکلپیس کے میں آپ کے تمام تھنے استعمال کرتی ہوں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ....“ وہ بہت حیرت اور الجھن سے اس کو دیکھتی کہہ رہی تھی جب اس لمحے کچھ ہوا۔ کچھ ایسا جو اس نے موقع نہیں کیا تھا۔

(”سحرِ عشق کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔“ وہ کتاب کھول کے چہرے کے سامنے کر چکا تھا۔  
بیر بانٹھر کے اسے دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب؟ تم نے خود کہا تھا کہ جاؤ گر کسی پر بھی سحرِ عشق کرو سکتے ہیں۔“

”ہاں۔ نہیں کہا تھا کہ وہ کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ....“ اس نے پڑھتے ہوئے صفحہ پلتایا۔

”سحرِ عشق کا انجام وہ نہیں ہوتا جو تم سوچ رہے ہو۔ یہ سحر کروانے والے کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔“

”کیسی قیمت؟“

وہ دونوں پارکنگ لाट میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اس کی نظریں زیاد شیطان کے چہرے پر تھیں اور اس لمحے کچھ ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے زیاد کا چہرہ بدل گیا۔ وہ ایک بھیڑ کے کاچھرہ بن گیا جس سے منہ پر خون لگا ہوا تھا۔ کشمالہ بدک کے دو قدم پیچھے ہٹی۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

(”سحرِ عشق کروانے والا ایک شیطان سے مددیتا ہے۔ اس کے ذریعے خود کو محبوب کی نظر وہ میں خوبصورت دکھاتا ہے۔ اور یوں وہ اپنا کنٹرول شیطان کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ شیطان کو سب سے زیادہ جو چیز پسند ہے وہ کنٹرول ہے۔ کسی انسان کی زندگی کو کنٹرول کرنا۔“)

اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ بدل گیا۔ واپس نارمل۔ کشمالہ نے پلکیں جھپکائیں۔ زیاد بخجلہ کے کچھ کہہ رہا تھا لیکن وہ سفید چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

(اور شیطان صرف وہ نہیں کرتا جو سارے سے کہے۔ وہ اپنی شرارت کا اضافہ بھی کرتا ہے۔ وہ ساحر اور اس کے

محبوب، دونوں کی زندگیوں کو کنٹرول کرنے لگتا ہے۔ وہ ان کو اپنی مرضی سے کچھ بھی دکھا سکتا ہے۔ ان کو ڈسٹریب کر سکتا ہے۔ خود جادو کروانے والے کو بھی۔)

”زیاد میں گھر جا رہی ہوں۔“ وہ اس کو دیکھے بنا تیزی سے کار کی طرف بڑھی۔ اسے سانس نہیں آ رہا تھا جیسے۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔

”کشمکشہ سوری۔۔۔ میری بات سنیں۔۔۔“

(اکثر اوقات شیاطین سحر عشق کو الٹا دیتے ہیں۔ جسے وہ خوبصورت بنا کے دکھار ہے تھے، اس کو کچھ اور بنا کے دکھاتے ہیں۔

”مملاؤ کیا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ مختلف لوگوں کے مختلف تجربات ہوتے ہیں۔ شیطان کا مقصد صرف ان کی زندگیاں ڈسٹریب کرنا ہوتا ہے، اسی لیے سحر عشق کا میاب نہیں ہوتا کیونکہ شیطان جس رشتے میں داخل ہو جائے، اس میں برکت نہیں رہتی۔)

”پلیز اسٹاپ۔۔۔“ زیاد اس کے پیچھے آ رہا تھا جب اس نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ وہ ناگھبی سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑک گیا۔ وہ گھرے گھرے سانس لیتی خوف ہے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں گھر جا رہی ہوں۔ ہم بعد میں بات کریں گے۔“ اس نے کاہر کا دروازہ کھولا تو ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

(جب انسان اپنے محبوب کو پانے کے لیے شیاطین کے پاس جائے تو وہ خود کو شیطان کے ہاتھ میں ایک کھلونا بنا دیتا ہے۔ وہ جو چاہے اس کے ساتھ کرے۔)

”مالا باجی کیا ہوا؟“ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا طوٹی ہکا بکارہ گیا۔ وہ لرزتے ہاتھوں سے کار اسٹارٹ کر رہی تھی۔ زیاد کار کے قریب آیا۔ وہ کچھ کہرہ ہاتھا۔ مغذرت۔ سوری۔ لیکن وہ نہیں سن رہی تھی۔

(”جادو ایک سراب ہے۔ ایک الوزن۔ کوئی انسان کسی کے دل میں جادو سے اپنی محبت پیدا نہیں کر سکتا۔ صرف اس کو ایک الوزن میں رکھ سکتا ہے۔ اور الوزن کا سارا مسئلہ یہ یہی ہے کہ وہ جتنا قریب آئے اتنا ہی جلدی کھل جاتا ہے۔“)

”پھر ہماری ماں اتنے برس تک تم کے ساتھ کیوں رہیں؟“

”اس کا جواب میں تمہیں پھر کسی وقت دوں گا۔“ ماہر نے کتاب چہرے کے سامنے کر لی۔)

وہ تیزی سے کارکور یورس کر رہی تھی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ہاتھوں میں ہنوز لرزش تھی اور چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔

اس نے دیکھا تھا جو اس نے دیکھا تھا۔ اور کوئی بھی چیز اس منظر کو اس کے ذہن سے کھرچ نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دروازہ زور دار آواز سے بند ہوا تو گنیز بیگم نے چہرہ اٹھایا۔

وہ اس وقت اپنے لاہور کے گھر کے ماشر بیدروم میں بیٹھی تھیں۔ بستر پر چند زیورات اور کف نکس کے ڈبے پھیلے تھے۔ ساتھ کھڑی بنگالی ملازمہ مزید ڈبے کھول کھول کے سامنے رکھ رہی تھی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا جس کے باعث باہر سے آتے قدموں کی آواز واضح سنائی دی۔

ملازمہ نامحسوس طریقے سے کمرے سے نکل گئی۔ گنیز بیگم بھی محملیں ڈبے کی طرف متوجہ ہوئیں جس میں سجا سیٹ آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ انہوں نے دو انگلیوں سے اس کا ائیرنگ اٹھایا۔

تیز قدم چوکھت پر رکے۔ پھر زیاد کی جھنجھلانی ہوئی آواز سنائی دی۔

”کچھ بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔“

”کر رہا ہے۔ اگلے ہفتے تمہارا اور کشمائلہ کا نکاح ہے۔“ انہوں نے ائیرنگ روشنی کی طرف اونچا کیا۔ پھر اسے الثایا۔ اس کا سہارا ٹوٹا ہوا تھا۔

”وہ میری دی گئی چاکلیٹس نہیں کھاتی، امی۔“ وہ شکست خور دہ سان کے قدموں میں فرش پر بیٹھا اور ان کے گھننوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اس کے چہرے پر زمانے بھر کی بُسی رقم تھی۔

”پہلے اس کی ڈبیٹ آف بر تھے غلط تھی۔ اب وہ چاکلیٹس نہیں کھاتی۔ ہر کچھ دن بعد ایک نئی رکاوٹ آ جاتی ہے۔“

وہ دونوں مٹھیاں بچنچے تکلیف سے کہہ رہا تھا۔

”نیا سہارا لگے گا۔“ انہوں نے افسوس سے سر ہلا کیا اور ائیرنگ کو واپس ڈبے میں ڈالا۔

”امی کچھ کریں۔ ورنہ سب کچھ خراب ہو جائے گا۔“

”اگلے ہفتے نکاح ہے، زیاد۔“ انہوں نے اب کے دوسرا ائیرنگ اٹھایا تو ہاتھوں میں ذرا سی لرزش تھی۔

”آپ نے سانہیں؟ وہ میٹھا نہیں کھاتی، امی۔ اور اسی بات پر ہمارا جھگڑا ہو گیا ہے۔“

”میں جانتی ہوں وہ میٹھا نہیں کھاتی۔ سب کچھ میٹھے میں نہیں ہوتا۔ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔“ وہ اب دوسرا

ایئرنگ الٹا پلٹا کے دیکھ رہی تھیں۔ وہ درست حالت میں تھا۔

”امی کچھ کریں۔ کوئی دم، کوئی وظیفہ، کوئی دعا۔ لیکن اب کچھ خراب نہیں ہونا چاہیے۔“

”نہیں ہو گا۔ خراب کرنے والے کو منظر سے ہٹا دیا ہے نا۔“ وہ اب زیور دا پس رکھ کے ڈبہ بند کر رہی تھیں۔ زیاد نے چونک کے انہیں دیکھا۔ ماتھے پہ بل پڑے۔ لب بھینج گئے۔

”وہ نہیں آئے گا؟“

”نہیں آئے گا۔“ انہوں نے ایک دوسرا ذبہ اٹھایا۔ وہ بالکل پر سکون تھیں۔

زیاد نے گہری سانس خارج کی۔ اس کی رنگت بحال ہونے لگی۔ پھر ان کے بوڑھے ہاتھوں کی لرزش دیکھی۔ چہرے پہ سایہ سا گزر رہا۔ کندھے ڈھیلے ہوئے۔

”دوالی آپ نے؟“ اس نے ان کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھے۔

”میرا مسئلہ دو سے حل نہیں ہو گا۔“ انہوں نے ڈبر کھا اور اس کو پہلی بار فرصت سے دیکھا۔ پھر مسکرائیں اور اس کے شانے پہ اپنا بوڑھا جھریلو زدہ ہاتھ رکھا۔

”میرا وقت قریب ہے، زیاد۔ مجھے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ لیکن میں اپنے بیٹے کو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے کر جاؤں گی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“

زیاد کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ان کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور آنکھوں سے لگایا۔

”سرکار۔“ اس کے لبوں سے عقیدت سے نکلا تھا۔ پھر نظریں اٹھا کے انہیں دیکھا۔

”ہم نے کچھ غلط تو نہیں کیا ہا، امی۔“

”ہرگز نہیں۔“ وہ طمانیت سے مسکرائیں۔ ”محبت پیدا کرنا غلط تھوڑا ہی ہے۔ ہم محبت پھیلاتے ہیں۔ نفرت نہیں۔ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ نکالا اور اس کے سر پر رکھا۔

”لیکن آپ کو میں نے پہلے بھی کہا تھا، زیاد۔ آپ کو اسے ناراض نہیں کرنا۔ اس طرح آپ اس کو خود سے تنفس کر دیں گے۔“

زیاد نے پشیمانی سے آنکھیں بند کیں۔

”اس کو کوال کریں۔ معافی مانگیں۔ اور معاملہ درست کر لیں۔ یاد رکھیں۔ ہم محبت بانٹتے ہیں۔ صرف محبت۔“

زیاد سلطان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”ہم محبت بانٹتے ہیں۔“

وہ مسکرا کیں اور زمی سے اس کے گال پہ ہاتھ رکھا۔ پھر بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”آپ نے دو اے لی، زیاد؟“

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ وہاں کوئی آواز نہ تھی۔ صرف ٹمپینہ بیگم کی نظر میں تھیں جو اس کے چہرے پہ جھی تھیں۔ بنا کسی سحر کے وہ ان کی نگاہوں میں دنیا کا سب سے خوبصورت نوجوان تھا۔ زیاد نہ نگی میں سر ہلا پا۔ اور گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب لوں گا۔“

”آپ کو خوشی چاہیے۔ آپ شادی کے بعد ہی خوش ہوں گے اور خوش رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ دوانہ چھوڑیں۔“

اس کے جانے کے بعد انہوں نے دھیرے سے سامنے رکھا ذبہ بند کیا۔ چہرے پر چھایا سکون اور اطمینان اب رفتہ رفتہ جانب ہونے لگا تھا۔ انہوں نے اور پچھت کی طرف دیکھا اور زیر لب بڑھ رہا تھا۔

”ونہیں آئے گا۔ نہیں آئے گا۔“ چہرے پر تنکر بھری لکیریں ابھر نے لگیں۔

A horizontal row of eleven empty star icons, used as a decorative separator or placeholder.

وہ گھر واپس آئی تو اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا اور رانگوں میں گویا جان نہیں تھی۔ تیزی سے لاڈنچ عبور کر کے اپنے کمرے کے دروازے تک آئی اور ہندل یہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ عقل ہے کسی نے بکارا۔

“‘？’”

وہ بیک کے مڑی۔ سانس گوبارک گیا۔

”کیا ہوا؟“ ماہی چند کپڑے اٹھائے کھڑی تجھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ماہی تھی۔ صرف ماہی۔ کوئی اور نہیں تھا۔ کشمائلہ نے گھری سانس خارج کی۔

”تم نے مجھے ڈرایا۔“

”تم ٹھیک ہو؟“

”ہا۔ مجھے کیا ہونا ہے؟“ وہ زبردستی مسکرائی۔ اسی لمحے کہیں پسِ منظر میں موسیقی گوچی۔ ایک مانوس سی دھن۔ پہلی برتھڑے ٹویو۔ نہ آواز نہ گانا۔ صرف موسیقی کی دھن۔ وہ چونگی۔

”یہ میوزک کہاں نج رہا ہے؟“

”میوزک؟“ ماہی نے تعجب سے اسے دیکھا اور پھر دل نہیں بانگیں۔ ”کون سا میوزک؟“

”نہیں۔ کچھ نہیں۔“ اس نے سر جھکا اور تیزی سے اندر جا کے دروازہ بند کر لیا۔

میوزک کی آواز اب بند ہو چکی تھی۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا اور وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ دل ہنوز زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”یہ کیا دیکھا تھا میں نے؟“ بے یقینی سے خود سے سوال کیا۔ کمرے نے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھئے گیا۔

بیڈ کا دوسرا کنارہ خالی تھا۔ وہاں اب ماں نہیں تھیں۔ وہ ہوتیں تو بتاتیں کہ کیا کرنا ہے۔ وہ ہوتیں تو زندگی مختلف ہوتی۔

اس نے دھیرے سے اپنے دونوں گالوں کو چھووا۔ آنکھیں بند کیں۔ گھرے گھرے سانس کھینچے۔ لیکن آج وہ سانس اسے ریا کیس کرنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ آج وہ کھلتے بند ہوتے نہ کے پاس جا کے چلا بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ آج کچھ نیا ہوا تھا۔ پہلے الجھن ہوتی تھی۔ پر یثانی۔ عدم تحفظ کا احساس۔ ایک کے بعد ایک گارڈ رکھا۔ پھر پرواہ کرنی چھوڑ دی۔ ماں کو کھو دیا۔ اب کیا کھونا رہ گیا تھا۔ پہلے جو تھا وہ خوابوں میں تھا۔ یاخون کے چھینٹوں کی صورت نظر آتا تھا۔ ایسا نہ تھا کہ نظر آئے لیکن وجود نہ رکھے۔ اگر جادو گرنے اس کی گردن دبو پھی تھی تو خون انکا تھا۔ وہ حقیقت تھا۔ لیکن جو آج ہوا تھا، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

کیا یہ اس کا وہم تھا یا حقیقت؟

کھڑکی پر دھیرے سے دستک ہوئی۔ دو دفعہ۔ پھر وقفہ۔ پھر تین دفعہ۔ وہ چونکی۔ کھڑکی کوں کھٹکھٹا سکتا تھا؟ پھر دھیرے سے اٹھی اور چھوٹے قدموں سے چلتی کھڑکی تک آئی۔ پر دے پہ ہاتھ رکھا۔ اسے ہٹا دے؟ یا نہ ہٹائے؟ دل بری طرح دھڑکا۔ نانگیں کمزور ہوئیں۔ لرزتی انگلیوں سے پر دہ سر کایا۔ چہرہ شیشے کے قریب کیا۔ باہر پھیلا لان دھوپ سے چمک رہا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کیا واقعی کسی نے دستک دی تھی یا اس کا ذہن اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا تھا؟

پہلے اس آن دیکھی مخلوق سے خوف آتا تھا۔ آج اس سے خوف نہیں آ رہا تھا۔ اپنے آپ سے آ رہا تھا۔

کھڑکی کو پھر سے کوئی بجائے لگا۔ پسی بر تھڈے ٹو یو کی طرز پر۔

”کیا میں یہ سب تصور کر رہی ہوں؟ اسٹر لیس؟ پیر انویا؟“ اب کہ وہ پر دہ ہٹانے نہیں اٹھی۔ بیڈ کے کنارے پر لیٹ گئی اور کشن کانوں پر رکھلی۔ وہ تھکی ہوئی تھی۔ اسٹر لیس میں تھی۔ اسے سو جانا چاہیے۔ جب وہ آنکھیں کھولے گی تو یہ سب ایک بڑے خواب کی طرح فضائیں تحلیل ہو چکا ہو گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سیاہ سفید اپارٹمنٹ میں مدھم زرد بیان جل رہی تھیں۔ سیاہ پردے ہٹئے ہوئے تھے اور دور تک پھیلی شہر کی بتیاں اور بوسفورس کنارے بندھی کشیاں دکھائی دیتی تھیں۔ بیر بل ایک صوفے پر لمبا لیٹا تھا۔ سینے کے اوپر دونوں ہاتھوں میں موبائل پکڑے وہ مسکرا کے کچھ نام پر کر رہا تھا۔

بیساکھیوں کی نکل کی آواز پر فیضی حامم نے چونک کے پیچھے دیکھا۔ ماہر اپنے کمرے سے نکل کے آتا دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں بیساکھیوں اور درست ٹانگ کے سہارے، دوسرے پاؤں کو قدرے ہوا میں اٹھائے وہ ٹی شرت اور ٹراؤزر میں ملبوس تھا، ماتھے پر بال بکھرے تھے اور چہرہ پہلے سے کمزور دکھائی دیتا تھا۔ وہ فکر مندی سے آگے بڑھیں۔

”آپ خود کیوں آئے؟ مجھے آواز دے دی ہوتی۔“

”آواز دیتا تو یہ سب کیسے دیکھتا؟“ اس نے ایک تیز نگاہ پتن کا فونٹ پڑا۔

فیضی حامم نے اس کی نگاہ کے تعاقب میں دیکھا۔ کاؤنٹر پر بیکری کا کھلا باسکس لکھا تھا جس میں چند پیش ریز دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ شرمندگی سے آگے بڑھیں اور جلدی سے اسے بند کر دیا۔

”میرے گھر میں یہ پرو سیسڈ شوگر اور میڈے سے بنی چیزیں کیوں موجود ہیں؟“ وہ بڑھی سے کہتا بیساکھی کے سہارے آگے بڑھا تو ایک دوسری ڈش دکھائی دی جس میں چند ادھ کھائے بقلاوے رکھے تھے۔

”بقلاوے؟ سیر نیسلی؟ بقلاوے؟“ اس نے گھور کے انہیں دیکھا۔ ”کبھی Turks کو کھاتے دیکھا ہے بقلاوے؟ نہیں۔ کیونکہ کوئی ترکی میں بقلاوے نہیں کھاتا سوائے سیاحوں کے۔ آپ کو اپنی صحت کا خیال ہے؟“

”وہ آدمی کہہ رہا ہے جو اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آج آفس گیا تھا۔“ بیر بل نے مسکراتے ہوئے موبائل سے نظر اٹھائے بغیر کہا۔ فیضی حامم سر جھکائے اب وہ چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔

”تمہیں اس وقت اپنی بیکری میں ہونا چاہیے تھا، بی۔“ وہ اب سہاروں سے چلتا، آتش دان کی طرف جا رہا تھا۔

لکڑی کے فرش پر بیساکھیوں کی تک تک سیدھی سر پر جا کے بجتی تھی۔

”ایک رو بوٹ کافی ہے نا اس گھر میں برو۔“ وہ ٹاپ کرتے ہوئے مسلسل مسکرا رہا تھا۔ ماہر آتش دان تک پہنچا، اور لائٹر اٹھایا۔ ایک بیساکھی پھسل کے نیچے جا گئی۔ اس نے کوفت سے اسے دیکھا۔ پھر دور صوفے پر لیٹے بیربل کو۔

”اس کے نام کا پہلا حرف کیا ہے؟“

”کس کا؟“ بیربل ہنوز ٹاپ کر رہا تھا۔

”جس لڑکی کے ساتھ گلے ہوئے ہو۔“

بیربل فرید کے ہاتھوں سے فون گرتے گرتے بچا۔ گڑبردا کے ایک دم اٹھ بیٹھا۔ گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ وہ آتش دان کے ساتھ کھڑا تھا اور ایک بیساکھی قدموں میں گری تھی۔

”کون... لڑکی؟ میں کسی لڑکی سے بات نہیں کر رہا۔ تمہاری نصیحت پر عمل کرتے ہوئے آج کل صرف خود پر فوکس کر رہا ہوں۔“ بظاہر سری انداز میں کہتا وہ اس کے پاس آیا اور جھک کے بیساکھی اٹھائی۔

”یقین میں اپنے کیک اور میکروزنگ کی تصویر ہے۔ دیکھ کے خوش ہو رہا تھا۔ آج ہم نے ایک بہت بڑی پارٹی کے لیے کیکس ڈیلور کیے ہیں۔“ بیساکھی اسے تھاماتے ہوئے وہ سنبھل کے مسکرا یا اور موبائل اسکرین اس کی طرف لہرائی۔

”کچھ لوگ اپنے گھر میں میرے کیکس پسند نہیں کرتے، یعنی وہ لوگوں کو میری بیکری کا نام ضرور تجویز کرتے ہیں۔“ شرات سے مسکرا یا۔ انداز معنی خیز تھا۔

”میں کسی کو تمہاری بیکری تجویز نہیں کرتا۔ مجھے دوسراے انسانوں کی صحت کا خیال ہے۔“ وہ لائٹر سے اب موم ہتی سلگا رہا تھا۔ آتش دان کے شیلف پر بنی ہلال کی تصویر مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

بیربل جواباً نہ دیا جیسے یقین نہ آیا ہو۔ پھر ایک خیال سے اس کی آنکھیں چمکیں۔

”اس ایونٹ کی تصویر یہیں مالک کو بھیجا ہوں۔ وہ سمجھتا ہے میری بیکری فلاپ ہے۔“

”تمہاری بیکری فلاپ ہے۔ کیونکہ تم توجہ، محنت اور روٹین سے کام نہیں کرتے۔“ وہ قدم قدم انگڑاتے ہوئے چلتا ایل شیپ صوفے تک آیا۔ بیربل بر امانے بغیر مسکرا کے موبائل کے بٹن دبارہ رہا۔

”دیکھنا۔ جل جائے گار بوٹ۔“

”مالک تمہاری پرواہ کرتا ہے، اسی لیے تمہیں ڈانٹتا ہے۔“ وہ سامنے صوفے پر بیٹھا۔ ناگ مری تو لوں سے کراہ

نکلی۔ چہرے پر تکلیف کے آثار مرتب ہوئے۔ بیساکھیاں پھر سے نیچے جا گریں۔

”مالک سوائے ماہر کے نہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ نہ پیار۔“ اس نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔ پھر ایک دم وہ چونک کے ماہر کو دیکھنے لگا۔

”ایک منٹ ایک منٹ... ماہر بے کے پاس آج میرے ساتھ بیٹھنے کے لیے وقت کہاں سے آگیا؟ پچھلے دو ماہ سے تم یا کتا میں پڑھتے تھے یا کمرے میں بند رہتے تھے۔“

ماہر خاموشی سے اسے دیکھتا ہا۔ بیربل کی آنکھوں میں شراری چمک ابھری۔

”تمہیں مجھ سے کچھ چاہیے ہے نا؟“

”کیا تم...“ ماہر کھنکھا را۔ بیربل مسکراہٹ دبائے سانس رو کے اس کا منتظر تھا۔

”کیا تم چند دن کے لیے میری وہیل چیز چلا سکتے ہو؟“

بیربل کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ کندھے ڈھلک گئے۔

”کیوں؟“ خنگی سے پوچھتا پکن کی طرف بڑھا۔ ماہر نے جواب نہیں دیا۔

”ڈاکٹر نے تمہیں بیساکھی استعمال کرنے کے لیے کہا ہے۔“ وہ فرتنج تک گیا اور دروازہ کھول کے اندر جھکا۔

”وہیل چیز تمہیں ست کر دے گی۔“ ایک لین تکال کے اس کا ڈھلن کھولا اور فرتنج کا دروازہ کھلا چھوڑ کے لاڈنخ کی طرف واپس آیا۔ فیضی حامم نے زیر لب بڑھاتے ہوئے دروازہ بند کیا۔

”بس چند دن کے لیے۔“

”کیوں؟ کہیں جانا ہے کیا؟“ اس نے کھڑے کھڑے سوڈا کا کینابوں سے لگایا۔

”ہاں۔ لا ہور۔“

سوڈافوارے کی صورت اس کے لبوں سے باہر نکلا۔ کینہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ وہ دو ہرا ہو کے کھانا۔

”کیا؟ لا ہور؟“ وہ دوبارہ کھانا۔ سوڈا کپڑوں اور فرش دونوں پر گرا تھا۔ فیضی حامم اف اللہ میاں کہتی تیزی سے آگے آئیں اور کینا اس کے ہاتھ سے لیا۔

”ہاں۔ لا ہور۔“ وہ بہت ضبط سے اس کی اوورائیٹنگ دیکھ رہا تھا۔

”اچھا وہ کیوں؟“ بیربل کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

”کام ہے۔“ ماہر نے ہاتھ بڑھا کے سائیڈ میبل سے پیپر ناول اٹھایا اور اس کی طرف بڑھایا۔

”اس کام کے نام کا پہلا حرف کیا ہے؟“ وہ مسکرا کے پیپر ٹاؤل سے شرت کا گریبان رگڑنے لگا۔ ماہر کہنی صوفے کے ہتھ پر کھے انگلیاں گال تلے جمائے ماتھے پر بل لیے اسے دیکھے گیا۔

”ایم۔ ہے نا؟“ بیربل نس کے اپنے سوال کا جواب دیتا سامنے بیٹھا اور پیپر ٹاؤل بھینچ کے فیضی حانم کی طرف اچھالا۔

”K.“ وہ دھیرے سے بولا تو بیربل نے ماتھے کو چھوا۔

”اوہ ہاں۔ K۔“ پھر ٹیک لگا کے ٹانگ پہنگ جمائی۔ اور سوچنے والے انداز میں گال تلے ہاتھ رکھے۔  
”لیکن میں نہیں آ سکتا۔“

”اور وہ کیوں؟“

”مجھے توجہ محنت اور روٹین سے اپنی فلاپ بیکری پر کام کرنا چاہیے۔“

”بیربل....!“ اس کی آواز جیسے ہی سخت اور بلند ہوئی، وہ اسی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”آرہا ہوں۔ آرہا ہوں کب چلانا ہے؟“ خفگی سے دونوں ہاتھ اٹھادیے۔ ”ویسے تمہیں کیسٹر فیکر نزس کا بندوبست کرنا چاہیے تھا۔“ بر امان کے بولا پھر ماہر کا چہرہ دیکھ کے ٹھٹھھکا۔

”اوہ۔ یقیناً پہلے تم نے نزس کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ لیکن خرچ بہت آرہا ہو گا۔ پھر تم نے سوچا، بیربل سے وہی کام مفت میں کروالوں۔“

”Precisely.“ ماہر فرید نے سر کو خم دیا۔ بیربل نے افسوس سے اس کو دیکھا۔

”ویسے تم کئی ہفتے پہلے بھی پاکستان جاسکتے تھے۔ میں نے کتنا کہا۔ تم نہیں گئے۔ اب یوں جا رہے ہو؟“

”کیونکہ زارا نے آج ایک ایسی بات کہی جو میرے ذہن سے نکل نہیں پا رہی۔“ اس کی آواز اب دھیمی تھی۔  
شکست خور دہ سی۔

”لیکن اگر اس جادوگر نے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو؟ اس نے یہ ایک سیڈنٹ تمہیں روکنے کے لیے کروایا تھا۔“ اس کی آواز میں تشویش تھی۔

ماہر نے فرش پر رکھی بیساکھیاں اٹھائیں، اور ان کو کہنیوں سے لگاتا اٹھا۔ چہرے پر تکلیف ابھر کے معدوم ہوئی۔

”ماہر فرید کسی سے نہیں ڈرتا۔ نہ کسی انسان سے۔ نہ کسی شیطان سے۔“ اس کی آنکھوں میں جھانک کے ایک ایک لفظ ادا کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بیساکھیوں کی ٹک ٹک اور مومن بھتی کی خوبصورتی میں پھیلی تھی۔

دفعتاً بیربل کے ہاتھ میں پکڑا مو بال قصر رایا تو وہ چونکا۔ مالک کا ممیش آیا تھا۔

”ایک پارٹی سے فلاپ پیکری ”برانڈ“ نہیں بن جاتی۔“

گوکہ الفاظ ناٹپ شدہ تھے، لیکن وہ ان کو مالک کی آواز میں اپنے کانوں میں سن سکتا تھا۔ اس کے لب مسکراہٹ میں ڈھلنے۔

”جل گیارہ بوٹ۔“



اسٹوڈیو کی کھڑکی سے آتی تیز روشنی میں چوکور فریم پتنا گیارہ شی کپڑا چمک رہا تھا۔ فریم کے گرد دو اسٹولز رکھے تھے جن میں سے ایک پہ وہ سرجھکا رہی تھی۔ بال فرنچ چوٹی میں بندھے تھے اور وہ گم صنم ہی ہاتھ میں پکڑے برش کو دیکھ رہی تھی۔

”مالا باجی آپ پریشان ہیں؟“ طوٹی دوسری جانب بیٹھا، دونوں گالوں کو ہتھیلوں پر گرانے اسے تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چونک کے چہرہ اٹھایا۔ پھر اسے دیکھ کے مسکراتی اور برش نیچے رکھ دیا۔

”کچھ سوچ رہی تھی۔“

”آپ کافون کافی دری سے نج رہا ہے۔“

مالا نے ایک نظر قریب رکھے فون کو دیکھا جو بنا آواز کے قصر رایا ہوا تھا۔ پھر بے دلی سے واپس برش کو دیکھنے لگی۔ وہ اس سے ابھی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اسے کسی سے تو بات کرنا تھی! ایک دم اس نے برش رکھا اور موبائل اٹھایا۔

پھر کامیکٹ لست کھولی۔

ایم سے ماہی۔ ماہی نیچے گھر میں ہی موجود تھی۔ اس کے سامان کی پینگ وغیرہ کروار ہی تھی۔ لیکن وہ ماہی سے کیا کہتی؟ زیاد نے مجھ سے عجیب طریقے سے بات کی ہے؟ ماہی کو ہر ایک پر شک کرنے کی عادت تھی۔ وہ فوراً سے خالہ کی بات پر غور کرنے لگ گائے گی۔ اوہ ہوں۔

اس نے لست نیچے کی صفورا؟ لیکن نہیں۔ زیاد کی اتنی تعریفیں کرنے کے بعد اس سے کیا کہوں؟

”مالا باجی آپ پینٹ کیوں نہیں کر رہی ہیں؟“ طوٹی ریشم پر بننے والہو رے چھوٹ کو فکر مندی سے دیکھ رہا تھا۔

”میں اپنے دوستوں کے نام دیکھ رہی ہوں۔“ وہ ابھی تک لست اور پر نیچے کر رہی تھی۔

”آپ کے تو بہت دوست ہیں، باجی۔ جب بھی آپ کو کوئی کام ہوتا ہے، کہتی ہیں فلاں کا فلاں فیلو کے بوتیک پر چلتے ہیں۔ فلاں کا فلاں فیلو کار ریسٹوران ہے۔“ وہ اس کے انداز میں نقل اتار کے بولا تو وہ بنس دی۔

”کیونکہ میں نے ایک prestigious یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا ہے،“ لڑکے۔ میرے کلاس فیلوز اپنی اپنی زندگیوں میں کامیاب ہیں۔ اور تم نے درست کہا۔ میرے بہت دوست ہیں کیونکہ میں کسی کو دشمن نہیں بناتی نہ لوگوں کو ناراض کرتی ہوں۔ لیکن....، اس کی فون پر جھکی نظروں میں ادا سی بھر گئی۔“ لیکن اب جب مجھے بات کرنی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دوست اصلی نہیں ہے۔ سب بس کام تک محدود ہیں۔ یہ فیور چاہیے۔ وہ کام کروانا ہے۔“

طوطی اب بورہو کے چاک سے اسچ پر لکیریں کھینچنے لگا۔ وہ اسے نہیں سن رہا تھا۔ وہ شاید خود کلامی کر رہی تھی۔ دفعتاً اس کا انگوٹھا ایک نام پر رکا۔ ماہر فرید۔ ایک تن مسکراہٹ لبوں پر در آئی۔ باقی سب دوست تھے۔ وہ کیا تھا؟ دوست تو ہرگز نہ تھا۔ اس سے تو غصے اور نفرت کا تعلق تھا۔ اس کو نہیں پکارنا۔ اس نے خود سے بہت پہلے وعدہ کیا تھا۔

”کیا واقعی غصے اور نفرت کا تعلق قائم تھا؟“ اس نے دل کو ٹول کے دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ نفرت۔ نہ غصہ۔ بس دکھ تھا۔ دھو کے کاظم تھا۔ لیکن معافی بھی نہیں تھی۔ چیخ کار استہ بھی نہ تھا۔

”ہائے اللہ....،“ طوطی کی چیخ پر اس نے چونکے سہراٹھایا۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے ریشم کو دیکھ رہا تھا جہاں ایک گلہ اس سے غلطی سے پینٹ کا چھینٹا پڑ گیا تھا۔

”میں نے آپ کی ساڑھی خراب کر دی....،“ اس نے بے یقینی سے ملا کو دیکھا۔ ملا نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔“ اس نے آرام سے ایک کاشن بدھا تھا اور اس دھبے سے پینٹ اتارنے لگی۔ گیلا پینٹ سرعت سے صاف ہونے لگا۔ طوطی کی رنگت ہنوز اڑی ہوئی تھی۔

”جانتے ہو خوشی یا پریشانی میں سب سے پہلے انسان میں کیا بدلتا ہے؟“  
طوطی نے ناگھبی سے اسے دیکھا۔ پھر سوچا۔

”کپڑے؟“

”نہیں۔ انسان کا سانس۔ ہر جذبہ انسان کا سانس بدلتا ہے۔ چاہے خوشی ہو۔ چاہے خوف۔ اگر ہم اپنا انسان کنشروں کرنا سیکھ جائیں تو ہم سب کچھ کنشروں کر سکتے ہیں۔ اپنی زندگی بھی۔ اور اپنے ذہن کو بھی۔ میری ساڑھی

خراب نہیں ہوئی۔ اور ذرا سے دھبے کی وجہ سے تمہیں اپنا سانس خراب نہیں کرنا چاہیے۔“ کاشن بذرکھا اور اسے دیکھ کے نرمی سے مسکرائی۔ طوطی نے ایک گھری سانس خارج کی اور پورے دل سے مسکرا دیا۔

”طوطی... طوطی....“ نیچے سے ماہی آوازیں دے رہی تھی۔ طوطی خان کے چہرے کے زاویے مگرے۔ سر جھلکتا اٹھا اور دروازہ کھول کے دھپ دھپ سیرھیاں اترتا نیچے چلا گیا۔

”کیا ہے ماہی باجی؟“ بے زاری سے طوطی کی آواز آئی۔

”نکے لڑ کے... چلو یہ کارٹن اوپر لے کر جاؤ۔“ وہ تحکم سے کہہ رہی تھی۔

”ماہی باجی... آپ نے کبھی چاند لیبر کے قوانین پڑھے ہیں؟“

”ابھی کان کے نیچے دوں گی تو سارے قوانین بھول جائیں گے۔ پورا دن تمہیں چالکلی پس کھلاتی ہوں۔ تحوزا سما کام بھی کرو اوساتھ۔“

وہ بڑا بڑا تھا ہوا کارٹن اٹھائے اور پر آیا۔

”فقط کھارہا ہوں، مala باجی۔ یہ آپ کی سوتیلی بہن ہے۔“ دھپ سے کارٹن ایک کونے میں رکھا جہاں اور بھی بہت سے کارٹن رکھے تھے۔ وہ جو باراپھر کہنے لگی جب ساعتوں میں کچھ گونجا۔ وہ ایک دمہنگی۔ پہی پر تھڈے ٹو یو۔ یہ گانا یا الفاظ نہیں تھے۔ صرف موسیقی تھی۔ جیسے کوئی آس طرز پر کوئی آلہ موسیقی بجارتھا ہو۔ صرف ایک دھن۔

”تم نے یہ آوازنی؟ کہیں میوزک نج رہا ہے۔“ وہ چونکے انداز میں دامیں بائیں دیکھنے لگی۔ طوطی نے اچھبئے سے اسے دیکھا۔

”دنہیں باجی۔ آپ کے کان نج رہے ہیں۔“ اور جیرانی سے سر جھلکتا واپس سیرھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی اسے ماہی کے کئی دوسرے کام بھی کرنے تھے۔

وہ جہاں تھیں؟ ہیں بیٹھی رہ گئی۔ موسیقی کی آواز اسے ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔ یہ پہی پر تھڈے ٹو یو والا میوزک ہی تھا۔ وہ اسے پہچانتی تھی۔ بے اختیار اس کی انگلیوں نے سیاہ فاختہ والے لاکٹ کو چھووا۔

نظریں فون پہ جھکیں، تو دیکھا... وہاں کامیکٹ لسٹ میں ماہر فرید کانا مہنوز جنمگار ہاتھا۔ لیکن یہ طے تھا کہ وہ اسے کال نہیں کرے گی۔

وہ کیا جانے کہ ان دیکھی آوازیں اور وجود نہ رکھنے والے چہرے کیا ہوتے ہیں؟



سلطان صاحب کے گھر کے لاڈنچ میں نیم اندھیرا ساتھا۔ بنگالی ملازمہ پانی کا گلاس اٹھائے تخت تک آئی۔ وہاں گنیزہ بیگم بر اجحان تھیں۔ گاؤں تکنیے کا سہارا لیئے وہ ایک پہلو کے بل نیم دراز، آنکھیں مومن دے تسبیح کے دانے گرارہی تھیں۔

ملازمہ کھنکھاری۔

”آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے، بی بی۔“

انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ چہرہ نحیف اور کمزور لگتا تھا۔ سر پہ پہنا سفید دو پٹھے کلائیوں میں سونے کے نکلن، اور کندھوں کے گرد بھوری شال۔ وہ بیماری میں بھی لباس کا خیال رکھتی تھیں۔ ہلاکا سماں سکرا نہیں اور دھیرے سے کہنی کے سہارے سیدھی ہو بیٹھیں۔ ملازمہ ادب سے قربی موزھے پہ بیٹھی۔ پانی کا گلاس انہیں تھامایا اور باکس سے گولیاں نکالیں۔

”زیاد صاحب بہت پریشان لگ رہے ہیں۔ کیا زیادہ جھگڑا ہوا ہے مالا بی بی کے ساتھ؟“ سپاٹ انداز میں پوچھتے ہوئے ایک گولی گنیزہ بی کی ہتھیلی پر کھکھلی۔

”ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی حل نکال لیں گے۔“ انہوں نے گولی پھانکی۔ اور پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔ ہاتھ کپکپار ہے تھے۔

”آپ کی طبیعت کیسے سنپھلے گی؟“

”آخری حملہ شدید تھا۔ عمل الشاپڑ گیا۔ ایسا کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔“

انہوں نے افسوس سے نغمی میں سر ہلا�ا۔ پھر دوسری گولی اس کی ہتھیلی سے اٹھائی۔

”لیکن اس بات کو تین مہینے سے اوپر ہو گئے ہیں۔ اب تک مولکوں کی طاقت بحال ہو جانی چاہیے۔“

انہوں نے عینک کے اوپر سے اسے دیکھا اور سکرا نہیں۔

”وہ بہتر ہو رہے ہیں۔“

ان کی آواز سر گوشی جیسی تھی۔ ایسی سر گوشی جو طوفانی ہوا نہیں کرتی ہیں۔ البتہ بنگالی ملازمہ کے چہرے پہ کوئی خوف تھا، نہ پریشانی۔ بس ایک عقیدت مندی تھی۔ اور بہت سا ادب۔

”تمہارے گھر میں سب خیریت ہے؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔ وہ بھی سکرا نہیں۔ اس کے

ہونٹ موٹے اور آنکھیں گہری تھیں۔

”آپ کی دعا سے سب خیر ہے۔“ ان بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں معنی خیز تاثر تھا۔

تبھی موبائل بجھنے لگا تو اس نے جلدی سے باقی دوائیں نگینہ بیگم کی ہتھیلی پر رکھیں اور بھاگ کے اندر کمرے میں گئی۔ واپس آئی تو ایک سیاہ اسارت فون ہاتھ میں تھا۔

”تم سنو۔“ انہوں نے اکتا ہٹ سے ہاتھ جھلا دیا۔ ”اور کہو کہ آج کل سرکار کوئی عمل نہیں کر رہی ہے۔“

اس نے سرا ثابت میں ہلا کیا اور فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف کی بات سن کے اس نے فون نیچے کیا اور دھیرے سے بولی۔

”ایئر پورٹ والے ایس ایف کے افسر کا فون ہے۔“

نگینہ بیگم چونکیں۔ تیزی سے کپکپا تا ہاتھ بڑھایا اور فون اس سے کھینچنے والے انداز میں لیا۔

”کیا بات ہے قریشی؟“ ان کا لہجہ چوکنا تھا۔

”سرکار... آپ کوڈ سٹرپ کرنے کی معدرت۔“ وہ بہت عقیدت سے بولا۔ ”آپ نے کہا تھا کہ آپ کو اطلاع کروں اگر وہ آدمی...“ رک کر نام پڑھا۔ ”ماہر فرید اس ملک میں داخل ہو۔“  
وہ سانس روکے سن رہی تھیں۔

”وہ آج صحیح پہنچنے والی فلاٹ میں اپنے بھائی کے ساتھ موجود تھام میں نے پاسپورٹ کنٹرول ڈیسک کی است میں اس کا نام دیکھا تو...“

نگینہ بیگم کی رنگت سیاہ پڑنے لگی۔ ایسے جیسے بہت سازہ رپی لیا ہو۔ انہوں نے فون پر لئے فاٹ دیا۔ ”وہ کیسے آگیا؟ وہ چل نہیں سکتا تھا۔“ وہ بڑا بڑا نیں۔ چہرے پر شدید بے بسی اور تکلیف ابھری۔

”موکلوں نے خبر نہیں دی؟“ ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ انہوں نے برمی سے اسے دیکھا۔

”موکلوں کے بس میں سب کچھ نہیں ہوتا۔ ان کی ہر خبر درست نہیں ہوتی۔ میں نے بھی کئی دن سے اس کی خبر نہیں لی تھی۔ سوچا تھا مسئلہ نہیں کرے گا۔“

”پریشان نہ ہوں، بی بی۔ وہ کیا کر لے گا؟“ اس نے زمی سے ایک اور گولی سامنے کی۔

”وہ سب خراب کر دے گا، اندرانی۔“ انہوں نے دو انگلیوں کے پوروں سے گولی پکڑی۔ اور اسے بناناپانی کے پھانک لیا۔ آنکھوں میں پریشانی بھی تھی اور خوف بھی۔

”وہ سب خراب کر دے گا۔ وہ مجھے ڈھونڈ لے گا۔“ پھر ایک تاسف بھری نظر زیاد کے کمرے کے بند دروازے پہ ڈالی۔

”وہ میرے بیٹے کا گھر نہیں بننے دے گا۔ اسے خوش نہیں ہونے دے گا۔ سب خراب کر دے گا۔“

”اب آپ کیا کریں گی؟“ اندرانی نامی ملازمہ فکرمندی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”میں وہ کروں گی جو پہلے نہیں ہو سکا۔“ وہ سیدھی ہو کے بیٹھیں اور کپکپاتے ہاتھوں سے تکیے کے ساتھ رکھا دوسرا فون اٹھایا، جوان کے عام استعمال میں تھا۔

”جب کینچوہ کنڈی میں ڈال کے پانی میں پھینکا جائے اور مچھلی اس کونہ پکڑے تو کیا کرنا چاہیے؟“  
”کیا؟“

”کنڈی دوبارہ سے پانی میں ڈالنی چاہیے۔ ایک کینچوہ میرے پاس ابھی ہے جسے اس دفعہ وہ ضرور پکڑے گی۔“ ان کے چہرے پہلکی سی مسکراہٹ درآئی۔ انہوں نے کامیکٹ استھ کھولی اور کشمالة کے نمبر پر انگلی رکھی۔

"ہیلو بیٹا... کیسی ہو؟" ان کی آواز نرم اور ملینٹھی ہو گئی۔ جیسے شہد ہو۔ جیسے ملائی ہو۔ "مجھے تم سے ایک کام تھا۔"

A horizontal row of eleven empty star icons, used as a decorative separator or placeholder.

ڈرائیور سفید الیس یو وی خاموشی سے چلا رہا تھا جگہ میں ہیٹر کی گرمائش تھی۔ البتہ باہر آج زیادہ سردی نہ تھی۔ گدلي وھند نے سردی کا تاثر دے رکھا تھا۔

وہ پچھلی سیٹ پہ بیٹھا، باہر بھاگتے درختوں کے جھروکوں سے نظر آتی نہر کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے سفید شرت کے ساتھ سیاہ سوت پہن رکھا تھا۔ بال ماتھے سے پچھے کو جمائے گئے تھے اور خسار کا نشان ویسا ہی تھا۔

”هم کہاں جا رہے ہیں؟“ ساتھ بیٹھا ہیر بل کھنکھارا۔

”اس سے ملنے جس کے لیے میں آیا ہوں....“ ماہر ہنوز بآہر دیکھتا رہا۔

بیربل اپنے بھائی کے حلیے کے رکس جینز شرٹ کے اوپر جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ گھنگریا لے بال، ایک کان میں بالی۔ کلامی میں بہت سے بینڈز۔ اور لبوں پر بکھری معنی خیز مسکراہٹ۔

”اس کے گھر یا وک پلیس؟“ احتیاط سے پوچھا۔

”ورک پلیس۔“ جواب پاٹ اور سنجیدہ تھے۔ بیربل نے مسکراتے ہوئے سر ہلا کیا۔

”اکیلے چلے جاتے۔ میری کیا ضرورت تھی؟“

”تم میرے نر ہو،“ وہ ابھی تک شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔

”تم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ تم مجھے مورل سپورٹ کے لیے ساتھ لے کر جا رہے ہو۔ لیکن نہیں۔“ بیربل بد مزہ ہوا اور سر جھنک کے باہر دیکھنے لگا۔ اب منظر بدل چکا تھا۔ باہمی طرف بہت سی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔

”ویسے ماہر...“ وہ کچھ یاد کر کے کہنے لگا۔ ”تم اور میں کبھی پیکیشن پر نہیں گئے، جیسے دوسرے بہن بھائی جاتے ہیں۔ میں پاکستان ہمیشہ اکیلا آتا تھا یا پھر .... (منہ کڑوا ہوا) مالک کے ساتھ زبردستی آنا پڑتا تھا۔“

”تم مالک کے ساتھ پیکیشن پر کب گئے؟“ وہ چونک کے اسے دیکھنے لگا۔

”جب میں اپنی بیکری شروع کرنے جا رہا تھا، اور مجھے پیسے چاہیے تھے لیکن تم ساری جانیداد پر سانپ بن کے بیٹھے تھے۔ تب تم نے شرط رکھی تھی کہ اگر میں نے مالک کو اپنے برونس پلان پر راضی کر لیا تو تم مجھے سرمایہ دے دو گے۔“ کچھ یاد کر کے مسکرا یا۔ ”مالک نہیں چاہتا تھا کہ میں استنبول میں بیکری بناؤ۔ اس لیے وہ مجھے کئی جگہوں پر لے کر گیا۔ کہ شاید میں استنبول کو بھا دوں۔“

”ہاں اور تم نے اسے بہت گھمانے کے بعد بھی اپنی ضد جاری رکھی۔ اس کی بات مان لیتے تو آج تمہاری بیکری کامیاب ہوتی۔“ وہ افسوس سے سر ہلاک کے پھر سے باہر دیکھنے لگ گیا۔

چند لمحے خاموشی سے کٹے۔ پھر بیربل کی زبان پر بھجا ہوئی۔

”اس کا عمل کیا ہو گا تمہیں دیکھ کے؟“

”کیا فرق پڑتا ہے؟ میں ہلال کے لیے اس سے ملنے جا رہوں۔“ بے قیازی سے شانے اچکائے۔ بیربل اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”اس کی ورک پلیس تو کافی خوبصورت ہے۔“

چند منٹ بعد وہ دونوں کار سے باہر تھے۔ بیربل اس کی وہیل چیز رکھیں رہا تھا۔ ساتھ ہی گردن موڑے ستائش سے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک مرمریں فرش والی عمارت میں داخل ہوئے۔ اس کی ہدایت کے مطابق وہ وہیل چیز سیدھا لفٹ کی طرف لے آیا۔

”اس کا غیث کافی اچھا ہے۔ آرٹسٹک۔“

”کیونکہ وہ آرٹسٹ ہے۔“ ماہر کا لہجہ سپاٹ تھا۔ کوئی تاثر نہیں۔ کوئی جذبہ نہیں۔

لفت کے دروازے ایک مرمریں سنگ روم کے دہانے پر کھلے۔ بیربل وہیل چیز آگے لے آیا۔ سامنے اثر کام پہ بیٹھی لڑکی نے ان کو دیکھ کے شناسائی سے سر ہلا کیا اور فون اٹھا کے کچھ کہنے لگی۔

بیربل ابھی تک ستائش سے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ خوبصورت ڈیکور۔ قیمتی پینٹنگز۔ تب ہی وہ چونکا۔ ایک دم دائیں بائیں دیکھا۔

”یہاں پودے نہیں ہیں۔“ بے اختیار ماہر کو دیکھا۔ وہ سامنے آفس کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔  
بیربل کے ذہن میں الارم سا بجا۔

”ایک منٹ... ایک منٹ...“ وہ تیزی سے سیدھا ہوا۔

”ہم کس سے ملنے آئے ہیں؟“

ماہر فرید نے جواب نہیں دیا۔ سامنے دیکھتا رہا۔

تب ہی آفس کا دروازہ کھلا اور ہیل کی بلکی تی آواز سنائی دی۔ بیربل فرید کی نگاہیں اوپر اٹھیں۔

سامنے ایک سفید کافتان پہنے ہوئے کٹ بالوں والی دراز قد عورت چلتی آرہی تھی۔ اس کی چمکدار آنکھیں اسموکی میک اپ سے تجھی تھیں۔

”بیربل فرید کے لیے یقینی سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ماہر نے چہرہ اس کی طرف جھکایا۔

”زارا نے مجھے احساس دلایا کہ میرے اور کبیرہ ساداں کے درمیان ایک چیز مشترک ہے۔ میں اسی کا کھون لگانے آیا ہوں۔“

”خوش آمدید مسٹر ماہر فرید۔ پلیز اندر آئیں۔“ ان کے استقبال کے لیے باہر آئی کبیرہ بیگم اب ان کے قریب آچکی تھیں۔

بہت سی کڑا ہٹ بیربل کے حلق میں گھل گئی۔



گدلي دھند میں ڈوبی شام سارے لا ہور کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔

مبین منزل کے پیچھے بنے کچن گارڈن میں بھی وہی دھند پھیلی تھی۔ وہاں زیادہ دور تک دیکھنا ممکن نہ تھا۔ لیکن اگر تم دیکھو تو وہ گھاس پہ بیٹھی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا سا سوئیٹر پہنے، پیروں کی آلتی پالتی کیے۔ اس کی نظریں فاختہ کی قبر پر جھکی

تحیں جہاں تازہ گھاس اگا تھا۔ گود میں رکھا موبائل آج خاموش تھا۔ زیاد نے کالز اور میسچر کرنا بند کر دیے تھے۔ اور اسے یہی خاموشی چاہیے تھی۔

وہ اپنی غلطیوں کی ذمہ داری لیا کرتی تھی۔ اور دوسروں کی غلطیاں جلدی معاف نہیں کرتی تھی۔ کیا اسے اپنا برسوں پر ان طرز زندگی بد لئے کی ضرورت تھی؟

وہ دھیرے دھیرے سر دنکوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ ذہن دور کہیں پیچھے جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## ۳ سال پہلے

یہ ان دنوں کی بات ہے جب اسے اوشن (Ocean) ریستوران کے لیے لا ہور سے اسلام آباد آئے ایک سال ہو چکا تھا۔

اسے ریستوران کی رینویشن میں چند ماہ لگے تھے اور اب وہ مکمل طور پر چالو ہو چکا تھا۔ البتہ ابھی تک وہ ایک کامیاب ریستوران نہیں بنا تھا۔ ظہیر کے لیے وہ ایک ایسا کنوں تھا جو پیسے کھارہا تھا، لیکن پیسے واپس نہیں آ رہے تھے۔

وہ ان دنوں ماموں کے گھر کی بالائی منزل پر بطور پھانگ گیست رہتی تھی۔ ماموں پہلے اس سے کرایہ لینے پر راضی نہیں تھے لیکن وہ بنا کرایے کے رہنا نہیں چاہتی تھی سو بہت بحث و تحقیق کے بعد بالآخر وہ راضی ہو گئے تھے۔ اس کی ان سے ملاقات کم ہی ہوتی۔ وہ صبح سے رات تک ریستوران میں ہوا رکھتی تھی۔ اور گھر بس سونے کے لیے آتی۔

ایک ایسی ہی رات وہ اپنے کمرے میں سورہی تھی جب اس کاموں باہل بھنے گا۔

وہ موبائل سائیلینٹ کر کے نہیں سوتی تھی۔ اس کاموں باہل ایک دن میں کئی دفعہ بجتا تھا۔ کبھی کنسٹرکشن کا کوئی نیا مسئلہ۔ کبھی فوڈ اسپلائی میں گڑ بڑ۔ جب وہ ریستوران سے باہر ہوتی، اس کے فون پر موجودی سی ٹی وی کیمروں کی ایپ اس کی توجہ اوشن سے بھٹکنے نہیں دیتی تھی۔

تیز گھنٹی نے اسے جگا دیا۔ ساڑھے گیارہ کا وقت ہوا تھا اور ریستوران کے ہیڈ شیف کی کال آرہی تھی۔

”میم... آپ کہاں ہیں؟“ وہ جیسے چلا رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

”ریستوران کے کچن میں آگ لگ گئی ہے۔ ہم نے فائر بر گیڈ کو بلوالیا ہے۔ آپ جلدی پہنچیں۔“  
کشمائلہ مبین کو بات سمجھنے میں چند لمحے لگے اور پھر وہ بھلی کی تیزی سے بستر سے نکلی۔

اوشن جس کو اس نے بہت محنت سے بنایا اور سجا لیا تھا، اس میں آگ لگی تھی۔ ایک سال کی محنت جل رہی تھی۔ اور  
تب ہی اسے کچھ یاد آیا۔

”اور میرا آفس؟ کیا وہ محفوظ ہے؟“

”ابھی وہاں آگ نہیں پہنچی۔ لیکن کچھ کہہ نہیں سکتا۔“

”اوہ نو۔“ تیزی سے جوتے پہنے دو پشاٹھایا اور پرس لیے باہر بھاگی۔

اس کے آفس میں اس کا لاکر تھا جو اس کے فنگر پرنٹ سے کھلتا تھا۔ وہ وہاں نصب کیا گیا تھا اور اس سے اس وقت  
نکالنا نہیں جا سکتا تھا۔ اس میں بہت کچھ تھا۔ اس کی سیونگز۔ اہم ڈاکو منش۔ بہت سا کیش۔ وہ سارا وقت ریستوران  
میں ہوتی تھی۔ اور ہر ریستوران اوزر کی طرح وہ اپنے آفس کو محفوظ ترین جگہ تصور کرتی تھی۔

”لا کر فائر پروف نہیں تھا۔ اف اللہ۔“

وہ تیزی سے ڈرائیور کرتی بار بار اپنے فون کو دیکھ رہی تھی۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ چہرے پر اب بھی ایکنی تھی۔ البتہ  
پہلے سے کافی کم۔ بال کندھوں تک آتے تھے اور ماٹھے پر بینکری صورت میں کٹے تھے۔ اسٹرینگ وہیل پر رکھے  
ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ وہ بار بار ایکسلیٹر پر پاؤں رکھتی۔ اسپیڈ تیز تھی۔  
اسی لمحے اس کی کار کے سامنے کوئی تیزی سے آیا۔

بس ایک لمحہ اور اس نے زور سے بریک پر پیرو رکھا۔ ٹائر چڑھائے۔ کار جھٹکے سے رکی۔ اس کا اپنا سر زور سے اوپر  
جالگا۔ ایئر بیگز کھل گئے۔

ایک لمحے کے لیے ساری دنیا گھوم گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ ایئر بیگز اور سیٹ بیلٹ سے خود کو آزاد کرتی تیزی سے  
باہر بھاگی۔ جھٹکا کھانے سے قبل وہ دیکھ چکی تھی کہ اس کی کار نے کسی کو نکل رکھا تھی۔

وہ ایک آدمی تھا۔ لباس سے مغلوب الحال لگتا تھا۔ وہ کار سے نکلا کے دور جا گرا تھا۔ خون کا فوار اس کے سر سے  
بہہ رہا تھا۔ ایک عورت اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔ وہ اوپنجی آواز میں چلاتے ہوئے اس کو روک رہی  
تھی۔ قریب آئی تو سارا منظر دکھائی دیا۔ خون میں لٹ پت آدمی۔ ایک رکی ہوئی کار جس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں

اور ڈرائیور نگ دور کھلا تھا۔ اور ایک پریشان تیڑ کی جو زخمی آدمی پہ جھکی ہوئی تھی۔  
وہ چیخیں مارتی ہوئی اس کی طرف بھاگی۔

”یہ کیا کیا؟ میرے بندے کو مار دیا تم نے....“ اس نے کندھوں سے پکڑ کے کشمالة کو پرے ہٹایا۔

”آئی... آئی ایم سوری....“ کشمالة مبین کا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ ہاتھ پیروں میں جان نہیں تھی۔ آدمی سر پہ ہاتھ رکھ کر اہ رہا تھا۔

”کمال... کمال....“ وہ عورت اس پہ جھکی چیخ رہی تھی۔

”سر پھٹا ہے اس کا۔ زیادہ گہری چوت نہیں ہے۔ اس جگہ اپنا دو پٹھہ رکھو۔ جلدی رکھو۔“ چلا کے ہدایت دی۔ عورت جلدی دو پٹھے کا گولہ بنائے اس کے سر پر رکھنے لگی۔

کشمالة نے سراٹھا کے سڑک کو دیکھا۔ قریب میں چند دکانیں تھیں۔ لوگ بھاگتے ہوئے اس طرف آرہے تھے۔ اس کا حواس بحال ہونے لگے۔ یہاں تھوڑی دیر میں لوگ جمع ہو جائیں گے۔ رات کے وقت وہ ایک ہجوم کے گھیرے میں ہرگز نہیں۔

”اس کو ہسپتال لے جاؤ۔ قریب میں ہسپتال ہے۔ اور وہاں جا کے مجھے کال کرو۔“ وہ تیزی سے اٹھ کے کارٹک گئی۔

”تم... تم بھاگ رہی ہو؟“ عورت نے غصے سے پلٹ کے اٹھ دیکھا۔

”بھاگ نہیں رہی۔ میرا آفس میں آگ لگی ہے۔ مجھے جلدی پہنچنا ہے۔“ وہ بھاگتے ہوئے واپس آئی۔ پس سے چند نوٹ اور اپنا کارڈ زبردستی اس کے ہاتھ میں تھامیا۔

”اس کا زخم گہرائیں ہے۔ اسے کچھ نہیں ہو گا۔ لیکن میرا بہت نقصان ہو جائے گا۔“ نگاہ اٹھا کے دیکھا۔ چند لوگ اس طرف آرہے تھے۔ وہ پنجوں کے بل سڑک پہ بیٹھی جلدی جلدی بولنے لگی۔ ”یہاں کوئی بھی اس کو ہسپتال لے جائے گا۔ پلیز میری بات سمجھو۔ وہاں جا کے مجھے کال کر دینا۔ اس پر میرا نمبر لکھا ہے اور پتہ بھی۔ مری کار کا نمبر تم دیکھ چکی ہو۔ میں بھاگ نہیں رہی۔ میں ایک گھنٹے تک سیدھی ہسپتال پہنچ جاؤں گی۔“

اگلے لمحے وہ تیزی سے واپس آئی۔ ہجوم اکٹھا ہونے لگا تھا۔ لوگ اس کی طرف اشارہ کر کے اوپھی آواز میں کچھ کہہ رہے تھے۔ اس نے دروازے بند کر لیے۔ کسی نے اس کا شیشہ کھٹکھٹایا۔ لیکن اس کا ایک ہاتھ گیئر پہ تھا اور پیور ایکسلیور پ۔ تیزی سے کار کو ریوس کیا اور زن سے آگے بھگا لے گئی۔

پھر بیک دیور میں دیکھا۔ کوئی اس کے پیچے نہیں آ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پسینے سے ترخی اور سانس بری طرح پھول رہا تھا۔

(تمہیں اس کو ہسپتال لے جانا چاہیے تھا۔) کسی نے اندر ہی اندر اسے ملامت کیا۔ لیکن اس نے نفی میں سر ہلا کیا۔

اوشن زیادہ اہم ہے۔ میرے ڈاکو منٹس۔ پیسے۔ قیمتی چیزیں۔ اور پھر وہاں بہت لوگ جمع ہیں۔ ساتھ ہی ہسپتال ہے۔ اسے کوئی ہسپتال لے جائے گا۔ اس کا سر پھشا تھا۔ وہ فج جائے گا۔ وہ فج جائے گا۔ وہ خود سے بڑا بڑا ہی تھی۔

مطلوبہ اسٹریٹ میں کار موڑتے ہی اس کی اوشن کی طرف بلند ہوئی۔ وہ چار دیواری میں بنا ایک اطالوی بنگلے کی طرز کا ریستوران تھا جو کہ درختوں کے پیچے چھپا تھا۔ وہاں چند کارز کھڑی تھیں۔ لیکن کوئی دھواں نہ تھا۔ نہ آگ کے شعلے۔ نہ فائر بر گیڈ۔ اس کے چہرے پہ اچنچھا ابھرا۔

وہ کار کھڑی کر کے بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ اندر میں ہال اندر ہیر تھا۔

”ظہیر۔ عباس۔ لاک۔“ اس نے فولادتے ڈرتے پکارا۔

تب ہی فضا میں موسیقی سی نج اٹھی۔ اندر ہیرے میں ایک دھن۔

پہلی برتھڈے ٹو یو۔ پہلی برتھڈے ٹو یو۔

اسی لمحے ساری بتیاں جل اٹھیں۔ شور سا بلند ہوا۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ شاک سے آنکھیں اور لب پتھر ہو گئے۔

سامنے ایک بڑی ٹیبل پہ کیک رکھا تھا۔ اور اس کے ارڈر ریستوران کے تمام ویٹرز اور اس کے چند دوست کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں ظہیر اور اس کی بیوی بھی شامل تھے۔ وہ سب ہنس رہے تھے۔ میوزک نج رہا تھا۔ تالیاں بجا کے اس کا استقبال کر رہے تھے۔

وہ وہیں چوکھٹ میں کھڑی تھی۔ شاکڈ۔ ششدڑ۔ زگاہیں گھما کے اطراف میں دیکھا۔ اوشن ٹھیک تھا۔ اور پر بنا اس کا آفس بھی ٹھیک تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔

”سر پرانز...“ اس کی اسٹمنٹ صاعقه ہنتے ہوئے کیک پر موم بتیاں جا رہی تھیں۔ اس کی نظریں گھڑی کی طرف اٹھیں۔ بارہ نج چکے تھے۔

”یہ پر یہ نک تھا؟“ اس کو اپنی آواز کنویں سے آتی سنائی دی۔ جواب میں ایک قہقہہ سنائی دیا۔

”آپ سارا دن ہمارے اور اوشن کے لیے کام کرتی ہیں میم۔ ہم آپ کے لیے کچھ اپیشل کرنا چاہتے تھے۔“  
وہ سب مسکراتے ہوئے اس کو دیکھ رہے تھے۔

”تجینک... تجینک یو۔“ وہ بدققت مسکرائی۔ پھیکی، خوفزدہ سی مسکراہٹ۔

”آپ کے ہاتھ پر خون لگا ہے۔“ ایک دم صاعقه نے کہا تو سب چونکے۔ اس نے بے اختیار اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ دائیں ہاتھ پر زخمی را گیر کا خون واضح نظر آرہا تھا۔ اس نے چہرہ اٹھایا۔ تمام نظریں اس پر تھیں۔ سب کو سانپ سونگھے گیا تھا۔

”اوہ نہیں۔ یہ تو.... دراصل....“ اس کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ ”راستے میں سڑک پر ایک... ایک فاختہ مری پڑی تھی۔ اس کا... اس کا خون ہے۔“ وہ جلدی سے مسکرا کے کہتے ہوئے آگے آئی۔

”تجینک یو اس سب کے لیے۔ تجینک یو گائز۔ میں ہاتھ صاف کرلوں۔“ اس نے اپنا بڑا فیس آن کر لیا۔ سب کی سانس میں سانس آئی۔ میوزک پھر سے بجنے لگا۔

وہ تیزی سے ریسٹ روم کی طرف آئی اور اسے اندر سے بند کر لیا۔ پھر ہاتھ اوپر اٹھا کے دیکھا۔ تازہ خون۔ خوف، بے یقینی آنکھوں میں بھر گئی۔

”یہ کیا ہو گیا؟“ اس نے دہل کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”اگر وہ مر جائی تو؟“

پس منظر میں وہی میوزک سنائی دے رہا تھا۔ پسی بر تھڈے ٹو یو۔ پسی بر تھڈے ٹو یو۔

وہ تیزی سے ٹل ٹلنے ہاتھ کیے خون کو رگڑ رہی تھی۔ گابی پانی بہہ کے سنک کے سوراخ لئے نیچے جاتا زمین میں جذب ہو رہا تھا۔



یہ قاسم فرید کے ۲ فس کا منظر تھا جو ایک برس قبل ان کی وفات کے وقت سے ماہر کے زیر استعمال تھا۔ اس شام وہ مینیجر زمبل کی بجائے کھڑکی کے قریب پچھی ورک میبل پر موجود نظر آرہا تھا۔ سفید شرٹ کے آستین موڑے سامنے رکھے ماؤل پر چہرہ جھکائے وہ احتیاط سے ایک نکلا جوڑ رہا تھا۔ یہا پارٹمنٹ بلڈنگ کا ایک ماؤل تھا۔ ہر چند لمحے بعد وہ رکتا، نفی میں سر ہلاتا اور پھر سے کچھ تجدیل کرتا۔

۲ فس میں مسلسل کرستی کے ٹاریز کی چیزیں چیس سنائی دے رہی تھیں۔ مینیجر زمبل کے پیچھے رکھی اور نجی کنشروں چیزیں

سے آرہی تھی جس پہ بیٹھی ہلال اس مسلسل دائیں بائیں ہلا رہی تھی۔ نظریں ماہر کے چہرے پہ جمی تھیں جو متوجہ نہیں ہو رہا تھا۔ میز پہ اس کا گابی بیک پیک رکھا تھا۔

جس روز وہ قطر سے اس کے لیے اسٹر ایری والی کینڈل لیے اپنی ماں اور شمس کی دلیزیر پہ گیا تھا، اس واقعے کو قریباً ایک سال گزر چکا تھا۔

”آپ بار بار قطر کیوں چلے جاتے ہو، ماہر بھائی؟“ اس نے پکارا۔ وہ کام کے دوران اسے بار بار پکارتی تھی۔ وہ بیرون کو اس کے نام سے پکارتی تھی لیکن اسے بھائی کہتی تھی۔

”کیونکہ میں وہاں کام کرتا ہوں۔ اور مجھے قطر اچھا لگتا ہے۔“ وہ سر جھکائے ایک کاغذ سے کچھ پڑھ رہا تھا۔

”آپ اس دفعہ قطر سے میرے لیے کچھ نہیں لائے؟“ اس نے پھر سے سوال پوچھا۔ وہ جیسے بور ہو رہی تھی۔

”لایا ہوں۔ دینا بھول گیا۔ دوسرے نمبر کا دراز کھولو۔“ وہ ماڈل پہ جھکا تھا۔

ہلال کی آنکھیں چمکیں۔ تیزی سے پیر نیچے کیے اور مطلوبہ دراز کھولا۔ اندر ایک سفید ڈبہ رکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ مسکرا ہٹ امڈ آئی۔ جلدی سے ڈبے کاربن اتارا۔ پھر احتیاط سے ڈھکن ہٹایا۔ اندر جھانا کا۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ اتر گیا۔

”پھر وہی؟ سینڈ کینڈل؟“ اس نے کینڈل جارزوں سے میز پر رکھا۔ شستے کے لکڑی سے ٹکرانے کی آواز آئی تو ماہر نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ بہت خنگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اس میں چاکلیٹ اور کافی کی خوبیوں ہے۔ تمہیں اچھی لگے گی۔“ اس کا چہرہ دیکھ کے وہ مسکرایا۔

”قطر میں کینڈلز کے علاوہ کچھ نہیں ملتا؟“ ہلال ست روی سے اسے واپس ڈالنے لگی۔ انہیں نے اسے سونگھا تک نہیں تھا۔ ”آپ نے مجھے اب تک آٹھ کینڈلز دی ہیں۔ میں اتنی ساری کینڈلز کا کیا کروں؟“ آپ کے آفس یا گھر میں ایک بھی کینڈل نہیں ہے۔ خود نہیں استعمال کرتے۔ بس میرے لیے لاتے ہو۔“

وہ بڑا بڑا تے ہوئے رہنے والے پس باندھ رہی تھی۔

ماہر دیہرے سے ہنس دیا۔ اور کاغذ ایک طرف رکھ کے پیچھے ٹیک لگا۔

”جب تک تم خوبیوں کی نہیں اس کی قدر نہیں کرسکوگی۔“

”بیرون میرے لیے چالکلیٹس لاتا ہے۔ ٹوانزا لاتا ہے۔ اسٹوری بکس لاتا ہے۔ آپ صرف کینڈلز لاتے ہو۔“

”کہاں، ایک دن تم ان کینڈلز کو پسند کرنے لگوگی۔“

ہلال نے چہرہ دونوں ہتھیلیوں پر گرا دیا اور خفگی سے اسے دیکھنے لگی۔

”پاپا کہہ رہے تھے ہم شاید پاکستان شفت ہو جائیں۔“ تھوڑی دیر بعد وہ آہستہ سے بولی تو وہ چونکا۔ آنکھوں میں اچنچنا در آیا۔

”کیوں؟“

”پتہ نہیں۔ لیکن اگر ہم پاکستان چلے گئے تو میں آپ سے کیسے ملوں گی؟“  
ماہر کے لب بھینچ گئے۔ ماتھے پر تفکر کی لکیریں ابھریں۔ لیکن پھر وہ زبردستی مسکرا دیا۔

”ڈونٹ وری۔ میں ان سے بات کروں گا۔“

تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ انگوٹھی سے دی جانے والی دستک۔ وہ اس کو پہچانتا تھا۔ ہلال بھی اسے پہچانتی تھی۔ اسی لیے فوراً سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا گابی بیک پیک اٹھا لیا۔

”میں ہلال کو پک کرنے آئی تھی۔“ چند لمحے بعد وہ ان کے سامنے کھڑی تھیں۔ ہلال بھاگتی ہوئی گئی اور ان کی ٹانگوں سے لگ گئی۔ انہوں نے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

”آپ ٹھیک ہیں؟“ وہ ماں کو دیکھ کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ چند لمحے وہ خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ ان سے اس سے زیادہ بات نہیں کیا کرتا تھا۔ لیکن آج اسے کرنی تھی۔

”شمس پاکستان کیوں شفت ہونا چاہتا ہے؟“ یہ نام لیتے ہوئے بھی اس حق تک کٹ رہا ہوا ہو جاتا تھا۔ رانیل نے گھری سانس لی۔

”اس کی جا ب چلی گئی ہے۔ اس کو پاکستان میں ایک اچھی جا ب کی آفر ہوئی ہے۔ اس کا بنس مانسٹر سیٹ نہیں ہے۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ وہ اس آفر کو قبول کر لے اور ہم پاکستان چلے جائیں۔“

”بس؟“ ماہر بغوران کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ رانیل نے جیسے تھوک نگا۔

”ہاں بس۔“

”دنیں۔“ شمس نے کچھ اور بھی کہا ہو گا۔ ”وہ بنا پلک جھپکے ان کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو گا۔“ کہ میں پاکستان والی آفر نہیں لوں گا اگر... اگر...؟“ اس نے ابر و اٹھایا۔

رانیل کے چہرے پر سایہ سالہ رہا۔

”اگر اس کو... یہاں کوئی اچھی جا بمل جائے۔ یہیں مے فیز میں کہیں۔“ انہوں نے نگاہیں جھکا دیں۔  
ماہر نے کرب سے آنکھیں بند کیں اور کنٹی مسلی۔ وہ اس کی ماں نہیں تھی۔ وہ نہیں کی بیوی تھی۔ وہ اس کامد عالے  
کر سا منے آئی تھی۔ واللہ وہ لوگوں کے بارے میں کبھی غلط نہیں ہوتا تھا۔

”شمش چاہتا ہے کہ میں اسے اپنی کمپنی میں جگہ دوں ورنہ وہ ہلال اور آپ کو یہاں سے لے کر چلا جائے  
گا۔“ بہت ساغصہ اندر ا بلنے لگا۔ وہ مزید کچھ کہتا لیکن ...

”آپ پاپا کو یہاں جا ب دے دو گے تو ہم یہاں سے نہیں جائیں گے؟“ ہلال ایک دم چکی۔ وہ چونکا۔ اسے  
بھول گیا تھا کہ وہ یہاں کھڑی تھی۔ ایک دم اسے احساس ہوا کہ اس کے پیروں میں نادیدہ زنجیریں پڑ چکی ہیں۔  
وہ بدقت مسکرا یا۔ ”آف کوس۔ میں شمس کو اپنے قریب جا ب دلوادوں گا۔ آپ لوگ پاکستان نہیں جائیں  
گے۔ شمس سے کہیے گا کہ مجھ سے ملے۔“

”تجینک یو، ماہر۔“ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو ہلال آگے بھاگ گئی۔ وہ بھی آگے  
بڑھنے لگیں لیکن ماہر ان کے قریب آیا اور پیچھے سے ان کے کان کے قریب جھکا۔

”آپ کے شوہر کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔ کب، کہاں، میں نہیں جانتا۔ لیکن واللہ وہ میرے ہاتھ سے  
ہی مرے گا۔“ سرگوشی میں کہا اور واپس پلٹ گیا۔ ملختیاں غصے سے بھیج رکھی تھیں اور چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔  
رانیل چونک کے اسے دیکھنے لگیں لیکن اب اس کی ان کی طرف پشت تھی۔ کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ ہلال کے  
پیچھے چل دیں۔

ماہر نے مو باکل اٹھایا۔ پھر رکھ دیا۔ مالک یہاں تھا نہیں۔ وہ آج کل بیربل کو مختلف سامنسے وندت کروانے ملک  
سے باہر گیا ہوا تھا۔ بیربل کو بکری کا بخار چڑھا تھا اور ماہر نے شرط رکھی تھی کہ اگر وہ مالک کو کنوں میں کر لے تو وہ اسے  
پمیے دے دے گا۔ مالک کی غیر موجودگی میں اس کے قریب کوئی ایسا قابل اعتماد انسان نہ تھا جس سے وہ مشورہ  
کر سکے۔

شمش کے ہاتھ بالآخر اس کی کمزوری آگئی تھی۔



زم دھوپ اوشن کے برآمدے میں چھن چھن کے آرہی تھی۔ برآمدے سے باہر نکلا اور داہمیں طرف مڑ جاؤ تو  
ایک چھجا سا بنا تھا جس ساتھ بوجن ویلیا کا درخت کھڑا تھا۔ اس کے نیچے ایک کرسی میز بچھی تھی۔ یہاں بیٹھو تو سرما

کی دھوپ بہت اچھی لگتی۔ نہ بہت سیدھی۔ نہ بہت ٹھنڈی۔ سردیوں میں وہ اس جگہ پہ بیٹھا کرتی تھی۔ یہاں اسے دن کی روشنی کے باوجود قدرے پرائیوری مل جاتی کیونکہ یہاں سے ریستوران کا کثر حصہ دکھائی نہ دیتا۔ سو وہ سکون سے اپنا کام کرتی رہتی۔

البتہ آج وہ کام نہیں کر رہی تھی۔ وہ وہی بیٹھی اضطراب سے انگلیوں مردُری تھی۔ گزشتہ دوراتوں سے وہ ٹھیک سے سوئی نہیں تھی۔ بار بارے موبائل کی بیجھی اسکرین کو دیکھتی۔ اس نے اس عورت کو اپنا کارڈ دیا تھا۔ پھر وہ کال کیوں نہیں کر رہی تھی؟ کال آئے وہ علاج کا خرچ مانگے اور یہ معاملہ ختم ہو۔

اسی لمحے گھنٹی بھی۔ اس نے تیزی سے فون اٹھایا۔ اگلے ہی لمحے جوش ماند پڑا۔  
ماں کی کال آرہی تھی۔

”کیسی ہو بیٹھی؟“ ان کی آواز سے لگ رہا تھا کہ فون گاؤں تکیے پہ اپنیکر پر رکھے خود تخت پہ بیٹھی ساتھ ساتھ کوئی سبزی چھیل رہی تھیں۔ یہ ان کا سبزی کاٹنے کا وقت ہوتا تھا۔ اور اس وقت وہ ہر روز اسے کال کیا کرتی تھیں۔ وہ ماں کو کم ہی کال کرتی تھی۔ اسے بھول جاتا۔ یادوں مصروف ہو جاتی۔ ویسے بھی ماں خود کال کر لیتی تھیں۔ اسے کم ہی ضرورت پڑتی۔

”ٹھیک ہوں، ماں۔“ وہ پھیکا سامسکرانی۔ یہاں ہے پر آمدے کا جو حصہ اسے دکھائی دیتا تھا وہ خالی تھا۔ دور باغیچے میں بھی اکا دکالوگ تھے جو ناشتے کر رہے تھے۔

”آواز سے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ پریشان ہو لیکن ہمیشہ کی طرح بتاؤ گی نہیں۔“ ان کا انداز سادہ تھا۔ پر سکون۔  
مالا کی آنکھیں بھگنے لگیں۔ کیسے پتہ چل جاتا تھا انہیں ہر دفعے؟

”مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے، ماں۔“ اس کا گارند ہنسنے لگا۔

”جان بوجھ کے کی تھی؟“ ان کا انداز نرم تھا۔

”نہیں۔ ہرگز نہیں۔ جو بھی ہوا، غلطی سے ہوا تھا۔“ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ ایک آنسو ٹوٹ کے گال پڑھک گیا۔

”پھر اس کو سدھارلو۔“

”کیسے؟“ اس نے ہتھیلی کی پشت سے گال رگڑا۔ ایک بچکی سی آئی۔ سانس بے ترتیب ہونے لگا۔

”اس دنیا میں غلطی کا نتیجہ بھگلتا پڑتا ہے۔ جب غلطی سامنے آئے تو اس پر اصرار نہ کرنا۔ معافی مانگ کے اس کو

سدھار لینا۔"

"اوکے۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نظریں اپنے پیروں پر جھی تھیں جو اس نے میز رکھے ہوئے تھے۔ ان پر سیدھی دھوپ پڑ رہی تھی۔

حور جہاں بیگم اپنے تخت پر راجحان تھیں۔ اپیکر فون بند کیا تو گلی انگلی سے پانی کا دھبہ فون اسکرین پر لگ گیا۔ وہ پرواد کیے بناؤ اپس آلوؤں کے تھال کی طرف متوجہ ہوئیں جن کو کاٹ کاٹ کے پانی کے برتن میں ڈال رہی تھیں۔

"دھیان سے۔ گر جاؤ گے۔" بخت بی پریشانی سے کہہ رہی تھیں۔ حور جہاں نے چہرہ اٹھا کے دیکھا۔ وہ اپنے نواسے کے پیچھے بھاگ بھاگ کے بہاں ہور رہی تھیں جو لا ونخ میں بھاگتا جا رہا تھا۔ کبھی کسی میز سے ٹکرانے لگتا تو کبھی اسے ٹھڈا آنے کے قریب ہوتا۔ ہر دفعہ بخت بی اسے گرنے سے بچا لیتیں۔

"اسے ایک دفعہ گرنے دو، بختو۔"

بخت بی نے پلٹ کے خفگی سے انہیں دیکھا۔

"اسے چوٹ لگ گئی تو؟"

"بچے جب بڑے ہونے لگیں تو انہیں ان کے حصے کی غلطیاں کرنے دینی چاہیں۔ گرے گا انہیں تو اسے گرنے کی تکلیف کیسے معلوم ہوگی؟" انہوں نے کہتے ہوئے ایک نظر کا لٹکنی پر رکھے موبائل کو دیکھا جس کی اسکرین پر پانی کا قطرہ ابھی تک ٹھہرا تھا۔ اور واپس سبزی کاٹنے لگیں۔

وہ ابھی تک اپنے دھوپ سے سہری ہوتے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ سانس ہنوز بے ترتیب تھا تب ہی کائن کے اسٹیل سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی تو چونکی۔ گردن موڑ کے دیکھا۔

ستون کی اوٹ میں برآمدے کا جو حصہ دکھائی دے رہا تھا وہاں ایک دیڑ کھڑا جھک کے ایک میز پر کافی رکھ رہا تھا۔ یہ میزا سے آدمی دکھائی دے رہی تھی۔ تب ہی اس نے سمجھا کہ خالی ہے۔ مگر... اس نے گردن کھینچی۔ نگاہ کا راستہ صاف ہوا۔ وہاں کوئی بیٹھا تھا۔

بھلی کی تیزی سے مالا نے پیر نیچے کیے۔ جوتے پہنے۔ اور ٹھیک سے بیٹھی۔ لباس کی نادیدہ شکنیں درست کیں۔ وہ یہاں بیٹھ کے ذاتی کالزاٹینڈ نہیں کرتی تھی۔ صرف اس صورت میں کرتی جب قریب میں کوئی نہ ہوتا۔ یونہی شرمندگی سی ہوئی۔ اس آدمی کو ساری آوازیں جاتی رہی ہوں گی۔

اور اس کی آواز بھی یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ چونکی۔ وہ آدمی ویٹر سے شکایتی لبجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔  
وہ تیزی سے اٹھی اور ستون کی اوٹ سے نکلی۔ پھر دو اسٹیپ چڑھ کے برآمدے میں آئی۔ یہاں چھاؤ تھی۔  
اب اسے کونے والی میز پہ بیٹھا شخص صاف نظر آرہا تھا۔ وہ ایک سوت میں مبوس ادھیر عمر آدمی تھا جس کے بال  
براق سفید تھے۔

”یہ اوٹ ملک oat milk نہیں ہے۔“ وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے کافی کا کپ واپس رکھتے ہوئے کہہ رہے  
تھے۔

”سر یہ اوٹ ملک کی کافی ہی ہے۔“ ویٹر منمنایا۔  
”سر میں مینیجر ہوں۔ کوئی ایشو ہے کیا؟“ وہ بہت شانتگی سے کہتے ہوئے ان کے سامنے آئی۔ ویٹر ادب سے دو  
قدم ایک طرف ہوا۔ سلوو بالوں والے آدمی نے نگاہیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ان کا چہرہ ایسے تھا جیسے برف کا بنا ہو۔  
”میں“ میں لیکن اس نے میری کافی ڈیری ملک سے بنائی ہے۔“  
(لیکو زانٹولرنٹ لوگ وہ ہوتے ہیں جو ڈیری ملک یا اس سے بنی چیزیں استعمال نہیں کر سکتے۔)

”لاک؟“ اس نے نگاہیں اٹھا کے لاک نامی ویٹر کو دیکھا۔ وہ خود باریستا بھی تھا اور بہت اچھی کافی بنا تھا۔  
”میں نے اوٹ ملک ہی ڈالا ہے۔“ اس نے بات دھرا تی۔

”سر آپ مجھے دو منٹ دیں گے؟ میں آپ کی کافی دوبارہ بھجواتی ہوں۔“ میں مسکرا کے انہیں کہا۔ ساتھ ہی  
آنکھوں سے سے لاک کو شارہ کیا۔ اس نے جلدی سے وہ کپ اٹھایا اور اس کے پیچھے چل دیا۔  
”ایویں خرے کر رہا ہے۔ یہ باہر سے آئے لوگ یہاں آکے زیادہ خرے شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے اوٹ  
ملک سے ہی کافی بنائی تھی۔“ کچن میں آکے لاک خنگی سے شروع ہو گیا۔ اس آدمی کے انگریزی لب و لبجے سے  
معلوم ہوتا تھا کہ وہ برطانیہ سے آیا ہے یا کافی عرصہ وہاں رہا ہے۔

مالا نے ایک نظر چھٹ کو دیکھا۔ پھر فرتج کے دروازے کو۔ یہاں کیمرہ نہیں لگا تھا۔ یہی سی ٹی کا بلانڈ سپاٹ  
تھا۔ کچھ دن پہلے فرتج یہاں موکیا گیا تھا۔ کسی نہ کسی وجہ سے کیمرہ لگنا رہ جاتا تھا۔

”تم نے اوٹ ملک ڈالا تھا؟“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے سختی سے پوچھا۔  
”قلم لے لیں میں نے ڈالا تھا۔“

”اس کا خالی ڈبا کہاں ہے؟“

”ڈبہ؟“ وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”اس دن میری سالگرہ پر سب پڑا کھار ہے تھے سوائے تمہارے۔ تم نے کہا تمہیں پڑا پسند نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے لاک، تم خود لیکھوڑ انٹولرنٹ ہو۔ اور تم کشمکش کی کافی میں عام دودھ ڈالتے ہو اور اوت ملک اور کوکونٹ ملک کے کارشن چھپا کے گھر لے جاتے ہو یا اپنی کافی میں استعمال کرتے ہو۔“

”نہ نہیں میم....“

”ظہیر یہ دودھ بہت مہنگے امپورٹ کرواتا ہے، بہت کم لوگ ہیں جو ان کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ تمہارے اوپر یہ امانت ہوتے ہیں۔ اور تم نے مجھے ایک کشمکش کے سامنے شرمندہ کروایا ہے۔ فی الحال میں اس معاملے کو فکس کر رہی ہوں۔ اس کے بعد تم میرے آفس میں آؤ گے۔ اور ہم اس بارے میں بات کریں گے۔“

تحوڑی دیر بعد وہ باہر آئی تو اس کے ساتھ لاک سر جھکائے کافی کاتازہ کپ کپڑے ہوئے تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے آئے۔ اس نے کپڈی میز پر رکھا تو مالانے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

سفید بالوں والے آدمی کا چہرہ سپاٹ تھا۔ جیسے برف ہو۔

”میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ میرے باریتاکی غلطی تھی۔ اب آپ کوشکایت نہیں ہو گی، سر۔“

”آپ نے اپنے باریتا کو برطرف نہیں کیا؟“ انہوں نے بغور ان کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔“ ملا کا لہجہ مطمئن تھا۔

عبدالمالک فرید نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

”اس نے میرا بہت قبیق وقت بر باد کیا ہے۔ آپ کو اسے برطرف کر دینا چاہیے تھا۔“

”نہیں سر۔ ذرا سا لیکھوڑ آپ کا کچھ خاص نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن اس کی برطرفی اس کی زندگی خراب کر سکتی ہے۔ نوکری کا چلنے جانا کسی کی بھی زندگی خراب کر سکتا ہے۔ میں آپ کی shallow ego کی وجہ سے ایک غریب کو برطرف نہیں کر سکتی۔“

”shallow ego“ وہ مسکرائے۔ جیسے اس کی بات دلچسپ لگی ہو۔

”جی۔ لیکن غلطی ہماری ہے اور میں اس غلطی کا مدعا کرنا چاہتی ہوں۔“

”وہ کیسے؟“ وہ مسکرا رہے تھے البتہ آنکھیں برف تھیں۔

کشمائلہ مبین نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔

”کوئی دوسرا کشمیر ہوتا تو میں اس کو ڈسکاؤنٹ واوچر دے دیتی اور کافی کابل نہ لیتی۔ لیکن آپ کو اس سب کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے شکایت ذرا سے پیسے بچانے کے لیے نہیں کی۔ نہ آپ کو لیکھوڑ سے اتنا فرق پڑتا ہوگا کیونکہ پاکستان میں بہت کم جگہوں پر اوٹ ملک دستیاب ہوتا ہے۔ آپ کو اکثر جگہوں پر ڈیری والی کافی پیٹی ہوگی۔“ وہ مسکراتی۔ وہ اسی دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”پھر میں نے شکایت کیوں کی؟“

”کیونکہ آپ کی بات نہ مان کے آپ کی تو ہیں کی گئی تھی۔ میں اس تو ہیں کامداوا کرنے کے لیے آپ کی کافی خود بنائے لائی ہوں۔ اور میں کسی کے لیے کافی نہیں بنایا کرتی۔ ایک دفعہ پھر، میں آپ سے معدورت خواہ ہوں۔“ بولتے بولتے اس کا سانس پھول گیا تھا۔

ان کے بر فیلے چہرے پر بلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ اور پھر معدوم ہو گئی۔ وہ اپنی میز کی طرف بڑھ گئی۔

”آپ ایک اچھی مینجر ہیں۔ لیکن....“ انہوں نے دو انگلیوں سے کپ کا بینڈل سے اٹھایا۔ پھر ایک گھونٹ بھرا۔

”لیکن؟“ وہ برآمدے کے اسٹیپ پر تھا۔ پلٹ کے اچھبے سے انہیں دیکھا۔

”لیکن آپ کو اپنے سانس پر کنٹرول نہیں ہے۔“

”سوری، سر؟“ وہ بوگن دیلیا کے درخت کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے سر کے اوپر گابی ٹھہریاں لٹک رہی تھیں۔

”جانتی ہیں خوش یا خوف میں سب سے پہلے کیا خراب ہوتا ہے؟“ ان کی نکاہیں اپنے کپ پہ جمی تھیں۔

”کیا؟“

”سانس۔“

اسی پل سورج کے سامنے سے بادل ہے۔ ڈھوپ نے بوگن دیلیا کی ٹھہریوں کے درمیان سے راستہ بنایا اور برآمدے کے فرش پر اپنی چند شعائیں پھینکیں۔

”اگر انسان اپنے سانس کو قابو کرنا سیکھ لے تو وہ اپنا ذہن قابو کر سکتا ہے۔ ذہن قابو کر لے تو وہ ہر قسم کے حالات کو قابو کر سکتا ہے۔ سب کچھ سانس سے شروع اور سانس پر ختم ہوتا ہے۔“

وہ اب سامنے دیکھتے ہوئے کافی کے گھونٹ بھر رہے تھے۔ جیسے خود سے بات کر رہے ہوں۔

مالا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور پلٹ کے نیچے اتر گئی۔ اب اس کا وجود ڈھوپ میں تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اندر ہال میں عباس کے ساتھ کھڑی تھی۔ شیشے کی دیوار کے پار برآمدہ دکھائی دے رہا تھا جہاں سفید بالوں والا شخص بیٹھا کافی پیتے ہوئے موبائل دیکھ رہا تھا۔

”یہ آدمی کون ہے؟“ اس کی مشکوک نظر میں ان پر جمی تھیں۔

”بس اتنا معلوم ہے کہ لندن سے آیا ہے۔ انویسٹمنٹ مینیجر ہیں۔ مختلف ریستورانوں کا دورہ کر رہا ہے۔ اسے غالباً اپنے لیے ایک ریستوران خریدنا ہے۔“

”سوال یہ ہے کہ اگر اسے ریستوران خریدنا ہے تو یہ اون میں کیا کر رہا ہے؟“

پہلو میں گری اس کی مٹھی بھینچ گئی۔ نظریں اٹھا کے سیر ہیوں کی طرف دیکھا جہاں اور پر کہیں ظہیر کا آفس تھا۔ سانس پھر سے چڑھنے لگا تھا۔

اسی پل فون بچنے لگا۔ غیر شناسنامہ۔ بالآخر۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

”جی جی..... میں کشمکش کیا۔ آپ نے کالہ نہیں کیا۔“ چھوٹتے ہی بے چینی سے پوچھا۔ ”آپ کے شوہر کی طبیعت کیسی ہے؟“

”طیعت؟“ وہ عورت رو تے ہونکے چلائی۔ ”وہ مر گیا ہے۔ تم نے میرا بندہ مار دیا ہے۔“

لمح بھر کے لیے سارے دنیا ہتمگی۔ اس کو لگا اس کا جانس جیسے بند ہو گیا ہے۔

قاسم فرید کے آفس میں اس وقت تناوٰ کی سی کیفیت تھی۔ ایک سرد ساتناو جو وہاں بیٹھے دونوں فریقین کے درمیان حائل تھا۔ جو نظر نہیں آتا تھا لیکن گھشن پیدا کر رہا تھا۔

کھڑکی میں رکھے اس کے باپ کے پوچھے عدم تو جبی کے باعث سوکھ چکے تھے۔ کمرے میں عود کی خوشبو پھیلی تھی جس میں سگار کی مہک بھی شامل تھی۔

”مجھے بلانے کے لیے شکریہ، ماہر۔“

کوٹ ٹائی میں ملبوس نہیں اس وقت ماہر کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکرا ہٹ تھی۔ وہ البتہ نہیں مسکرا رہا تھا۔ بس پتلیاں سکوڑے اس کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کو اندر تک پڑھ رہا ہو۔

”ماں نے بتایا کہم ہلال اور ماں کے ساتھ پاکستان شفت ہونا چاہتے ہو۔“

شمہ کی مسکراہٹ گھری ہوئی۔

”تم جانتے ہو میری جاب چلی گئی ہے۔ پاکستان میں میرے کزن نے ایک جاب آفر کی ہے۔ وہاں میری فیملی ہے۔ ان کے پاس چلا جاؤں گا۔ ہلال اور رانیل بھی وہیں رہیں گی جہاں میں رہوں گا۔“ اس کی چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھیں ماہر پہ جھی تھیں۔

اس نے بہت کچھ حلق سے نیچے اتارا۔ اسے ضبط کرنا تھا۔ ہلال کے لیے۔ ماں کے لیے۔

”ہاں اگر مجھے یہاں کوئی اچھی جاب مل جاتی تو شاید میں نہ جاتا۔“ اس نے شیو کھجائی۔ ماہر نے ایک نظر دیوار گیر بک شیلف کو دیکھا جہاں بہت سی کتابیں، فریم اور شیلڈز رکھی تھیں۔ ان میں ایک تصویر اس کے پاس کی بھی تھی۔ وہ ان کے پیچے کھڑا، ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ وہ دونوں کیمرے میں دیکھ کے مسکرا رہے تھے۔ اس نے واپس شمس کو دیکھا۔ اس کے باپ کے باڑی گارڈ کی نوکری سے شروع ہونے والا شمس الدین آج انہی کے آفس میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

”اگر تمہیں یہیں کہیں جاب مل جائے تو نہیں جاؤ گے؟“ اس نے دراز کھولا اور ایک باکس نکالا۔

”ہاں۔ اگر تمہارے آس پاس کوئی جاب ہو تو میں یہیں رہ جاؤں گا۔“

”جاب بنائی جاسکتی ہے۔“ ماہر نے باکس سے ایک سگار نکالا۔ پھر میز پر کھا چاقوا اٹھایا۔

”تمہارا شکر یہ۔ میرے لیے اتنا سوچنے کا۔“

”سوال یہ ہے کہ ...“ وہ چاقو سے سگار کاٹنے لگا۔ ”کیا تم میری بتابی گئی جاب قبول کرلو گے؟“ شمس کی نظریں اس کے ہاتھوں پہ جمی تھیں جو مہارت سے سگار کو چھیل رہے تھے۔

”شیور۔ کس قسم کی جاب ہے؟“

”فناس ڈیپارٹمنٹ میں۔ ایک بہت اچھی سلیری اور ان شور نسز کے ساتھ۔“ اس سگار انگلیوں میں دبایا اور لاٹھا اٹھایا۔

”بہترین۔“ شمس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ آنکھیں چمکیں۔ بالآخر وہ قاسم فرید کی کمپنی میں داخل ہونے جا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ کل صبح اس آدمی سے مل لو۔ یہ تمہیں ہار کر لے گا۔“

اس نے ایک کارڈ شمس کی طرف بڑھایا۔ شمس نے مسکرا کے کارڈ اٹھایا۔ اگلے ہی لمحے اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ چونک کے ماہر کو دیکھا۔ وہ ٹیک لگائے بیٹھا، سگار سلگار ہاتھا۔

”لیکن ماہر... یہ تمہاری کمپنی تو نہیں ہے۔“

”میری کمپنی درمیان میں کہاں سے آگئی؟ تمہیں مے فنیر میں جاب چاہیے تھی نا۔ میرے آس پاس۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے وہ پہلی دفعہ مسکرا یا۔ ان کا آفس ہمارے قریب ہی ہے۔ پانچ منٹ کی واک پر۔“

شم کی مسکرا ہٹ اب غائب ہو چکی تھی۔ چند لمحے کے لیے اسے سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔

”مجھے لگا...“

”تمہیں لگا کہ میں تمہیں اس کمپنی میں کام کرنے دوں گا جہاں ایک زمانے میں تم میرے باپ کی کار کا دروازہ کھولتے تھے۔ پچ پچ۔ تم مجھے ٹھیک سے سمجھے نہیں ہو، شمس۔“ افسوس سے سر دائیں باائیں ہلایا۔ پھر سگار کا کش بھرا، بہت سادھوں لبوں سے نکلا۔ اس نے سگار جھٹکا اور آگے کو جھک کے شمس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی رنگت پھیکی پڑ چکی تھی۔

”ماہر فرید کو کوئی ایسوں نلی بلیک میں نہیں کر سکتا۔ میں نے ہلال سے وعدہ کیا تھا تمہیں اپنے قریب جاب دلوانے کا۔ اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ چاہو تو میری آفر قبول کرو۔ چاہو تو ماں اور ہلال کو لے کر پاکستان شفت ہو جاؤ۔ تمہاری مرضی۔“ اس نے واپس ٹیک لگالی۔ شمس پھیکا سامسکرا یا۔

”مجھے منظور ہے۔ کم از کم میں تمہارے قریب رہوں گا۔“ پھر لگاتی پپر کھا ایک بارکس اٹھایا جو وہ ساتھ لایا تھا۔

”تم مجھے پسند نہیں کرتے لیکن بہر حال میں تمہارے آفس کے لیے ایک تھنڈا لایا تھا۔ اس کو اپنے آفس میں جگہ دو گے تو مجھے خوشی ہو گی۔“

اس نے بارکس کا ڈھکن اٹھایا تو ماہر نے عدم دلچسپی سے دیکھا۔ وہ ایک شترنج کے گھوڑے کی شکل کا بک ہولڈر تھا۔

”ہوں۔ شکر یہ۔“ بے دلی سے کہا اور سگار ہونتوں سے لگایا۔

”ہلال نے اسے پسند کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ تمہارے بک شیلف میں اچھا رکھے گا۔ کیا میں اسے یہاں رکھ دوں۔“

اس گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا۔ ماہر نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”شیور۔“ وہ ہلال کی پسند تھا۔ اور اگر نہ ہوتا۔۔۔ تب بھی ایک گھوڑا اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا؟



وہ اپنے آفس میں کھڑی تھی۔ میز پر اپنے سامنے اس نے چند چیزوں کی کٹھی کر کھی تھیں۔ فائلز۔ ڈاکومنٹس۔ ایک پودا۔ چند فریمیز۔

”مجھے ایک ایسا باکس لا کر دو جس میں یہ سب پورا آجائے۔“ حیران تی کھڑی اپنی اسٹینٹ صاعقه کو حکم دیا۔ وہ سر ہلا کے باکس ڈھونڈنے چلی گئی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ مالا میڈم صحیح اپنا سامان کیوں اکٹھا کرنے لگ گئی ہیں۔

موباکل بجھنے لگا تو مala نے گھری سانس لینی چاہی لیکن تنفس پھر سے بے ترتیب ہونے لگا۔ وہ عورت باہر آچکی تھی۔ اسے ایک مشکل ملاقات کرنی تھی۔ اس نے دیوار پر لگے آئینے میں ایک دفعہ خود کو دیکھا۔ ماتھے پر کٹے بال۔ اوپھی کس کے بنائی پوپنی۔ کان، گردن اور ہاتھ کسی قسم کے زیور سے بے نیاز تھے۔ چہرے کی سرخ گابی ایکنی چمک رہی تھی۔ پیروں میں ہائی ہیلدر تھیں۔

وہ باہر آئی تو میں ہاں میں بجتا میوزک ایک دم بدلا۔ پہی بر تھڈے ٹو ٹو کی دھن سنائی دینے لگی۔ وہ چونکی کونے میں کمپیوٹر پر بیٹھا آپریٹر کی بورڈ پر جھکا تھا۔ مala کے ماتھے پر بل پڑے۔ تیزی سے اس کی طرف لپکی۔

”مجھے یہ میوزک اب نہ سنائی دے۔“ اس کے سر پر ٹکٹک کے وہ ایک دم غرائی۔ وہ گڑ بڑا گیا۔

”سوری میم۔ میں پلے است چیک کر رہا تھا۔ اس دن آپ سی سالگی ہو پہ یہ لگایا تھا تو خود ہی پلے ہو گیا۔“

”کہانا۔ یہ میوزک مجھے اس ریستوران میں نہ سنائی دے۔ کچھ اور لگالو۔“ جب اختیار اپنے ہاتھ دیکھے۔ آج وہ سرخ نہیں تھے۔ اس نے گھری سانس خارج کی۔

آج بھی برآمدے کے کونے والی میز پر وہی صاحب بیٹھے تھے۔ لیپ ٹاپ سامنے رکھے وہ اس پر کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ ان سے نگاہ ملانے بغیر آگے آئی۔ برآمدے کے اسٹیپ اتر کے نیچے آئی تو دیکھا۔ اس کی میز سیاہ چادر میں وہی عورت بیٹھی تھی۔ مالا کو دیکھ کے وہ کھڑی نہیں ہوئی۔ بس اسے گھوڑے گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”عاصمہ بی۔ ہم اندر میرے آفس میں چل کے بات کرتے ہیں۔“ وہ زمی سے کہتی ان کے قریب آئی۔

”مجھے اندر نہیں جانا۔ یہیں سب کے سامنے بات کرنی ہے۔“ وہ ایک دم پھنکاری۔

مالا نے گردن موڑ کے دیکھا۔ سوائے سفید بالوں والے آدمی کے، قریب میں کوئی نہ تھا۔ اس نے کرسی کھینچی۔

”ٹھیک ہے لیکن آرام سے بات کریں۔“ زمی سے تنبیہہ کر کے وہ ان کے سامنے بیٹھی اور ٹانگ پر ٹانگ

جمالی۔

”میں اس واقعے کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔“

عورت نے اس کی معدیرت کو نظر انداز کر کے نگاہیں گھما کے اطراف میں دیکھا۔

”تم تو کہہ رہی تھی تمہارے آفس میں آگ لگ گئی تھی۔ کہہ رہے آگ؟“

کشمالة نے ناک کے ذریعے سانس اندر کھینچا۔ پھر دھیرے سے خارج کیا۔ تنفس قدرے بہتر ہوا۔

”میں بہت شرمندہ ہوں۔ آئیں سوسوری۔ میں ہر قسم کامدا کرنے پر تیار ہوں۔“

”اب کیسامداوا! بی؟ تم نے میرا بندہ مار دیا ہے۔“ وہ روٹے ہوئے غصے سے بولی۔

بوگن ولیا کے پھولوں میں ہوا سے سر سراہٹ ہوئی۔ پھر ہر طرف خاموشی چھاگئی۔ عبدالمالک فرید نے لیپ ٹاپ سے نگاہیں اٹھا کے اس طرف دیکھا جہاں درخت کی چھاؤں میں وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ پھر انہوں نے واپس لنگاہیں جھکا دیں۔

”عاصہ بی...“

”اس کا خون بہت بہہ گیا تھا۔ لوگوں لے ہستال لے جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ بڑی مشکل سے ہم ہستال پہنچے۔ وہاں جاتے ہی اس نے دم توڑ دیا۔ تم بڑے لوگوں گاڑی چلاتے دائیں باائیں کیوں نہیں دیکھتے؟“ اس کے آنسو بہرہ ہے تھا اور آواز کپکپار ہی تھی۔

کشمالة مبین نے ایک گہری سانس اندر کھینچی۔ پھر اسے دھیرے سے خارج کیا۔ اب اس کو سانس نہیں چڑھرہا تھا۔

”وہ کراسنگ نہیں تھی۔ وہ اچانک سے میرے سامنے آیا تھا۔ غالباً وہ خود کشی کرنے جا رہا تھا کیونکہ آپ اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اسے روک رہی تھیں۔ لیکن کلی یہ میری غلطی نہیں تھی۔“

”یہ بات پولیس کے سامنے کہنا یا عدالت میں۔“ وہ دبادبا ساغرا میں۔

”اگر آپ نے پولیس کے پاس جانے ہوتا تو آپ وہاں جاتیں۔ یہاں نہ آتیں۔ چاہیں تو مجھے لے جائیں پولیس کے سامنے۔ میں ڈرتی نہیں ہوں۔“ وہ لیک لگائے ٹانگ پٹانگ جمائے پر سکون سی بیٹھی تھی۔ ”لیکن میں پھر بھی آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ مجھے اس کو خود ہستال لے جانا چاہیے تھا۔ انسانی جان ہر قسم کے کام سے اوپر ہوتی ہے۔“ چہرہ اٹھا کے ریسٹوران کی عمارت کو ایک نظر دیکھا۔

”اب میں کیا کروں گی۔ وہ میرے بچوں کا واحد سہارا تھا۔ اس کی تنخواہ کے بغیر ہمارا گزارا کیسے ہو گا؟“

”میں کہہ رہی ہوں نا۔ میں آپ لوگوں کا خیال رکھوں گی۔ یہ کچھ قسم ہے۔“ اس نے پرنس سے ایک چیک نکالا اور ان کے سامنے رکھا۔

”یہ کھلیں۔ دوبارہ بھی چاہیے ہوں تو میرا پتہ آپ کو معلوم ہے۔ میں آپ کو بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤں گی۔“ وہ اسی زمی سے کہہ رہی تھی۔ دھوپ سے اس کی آنکھیں شہری لگ رہی تھیں۔

وہ عورت چیک چادر میں دبائے وہاں سے اٹھ کے چلی گئی۔ تو اس نے آنکھیں بند کیں۔ ایک سانس ناک سے کھینچی۔ اندر تک اس کو روک دیا۔ پھر ایک دو تین چار پانچ گنا۔ پھر اس کلبوں سے خارج کر دیا۔ بہت سا بوجھ سینے سے ہٹ گیا۔

”وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ اس کا شوہرن نہیں مرا۔“

وہ لیپ ٹاپ پہ نظریں جمائے بولے تو مala نے چونک کے انہیں دیکھا۔ پھر اداستی سے مسکراتی اور اٹھ کے برآمدے تک آتی۔

”آپ کو کیسے معلوم؟“

”اس کی آواز، آنکھیں، سب بتا رہی تھیں کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ ادا کاری کر رہی ہے۔“ انہوں نے نگاہیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ان کا چہرہ آج بھی برف جیسا تھا۔

”جانتی ہوں۔“ اس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ ”جب اس نے مجھے کال کی تو میں نے اس کے نمبر سے اس کے گھر کا ایڈر لیں نکوالیا۔ میری اسٹمنٹ اس کے محلے میں جا کے چیک بھی کر آئی تھی۔ اس کے شوہر کا زخم گہر انہیں تھا۔ وہ ٹھیک ہے۔ اگر اسے کچھ ہوا ہوتا تو وہ مجھے اپنے گھر باتی۔ یہاں نہ آتی۔“

”پھر آپ نے اسے پمیے کیوں دیے؟“

”کیونکہ غلطی میری ہی تھی اور میں اپنی غلطیوں کی ذمہ داری لیا کرتی ہوں۔“ اس کا انداز سادہ تھا۔ ”مجھے اس کو خود ہسپتال لے جانا چاہیے تھا لیکن میں نہیں لے کر گئی۔ مجھے یہ ریستوران زیادہ عزیز تھا۔ اور سناء ہے آپ اس کو خریدنے کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

”کیا اس ریستوران کو بک نہیں جانا چاہیے؟ یہاں رش نہیں ہوتا۔“

”پھر آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“

”کیونکہ یہاں رش نہیں ہوتا۔“ انہوں نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں میں سکون سے اپنا کام کر سکتا ہوں۔“

”یہ ریسٹوران فارسیل نہیں ہے۔ آپ کہیں اور جا کے وندوشاپ کریں سر۔“ مسکرا کے سرد لبھے میں کہا اور واپس اپنی میز کی طرف چلی گئی۔ اپنالیپ ٹاپ کھولا تو دھوپ سے چمکتی اسکرین میں اپنا چہرہ دکھائی دیا جس پر زمانے بھر کی خفگی تھی۔ اور اضطراب بھی۔

(اگر اس آدمی نے اوشن خرید لیا تو؟) وہ عدم تو جہی سے کام کر رہی تھی۔ ذہن بہت سے مسئلou میں الجھا تھا جب سلوربالوں والے آدمی کی میز سے آتی آوازوں نے اسے چونکایا۔

”اس ریسٹوران میں کیا برائی ہے؟“ وہ اسی سپاٹ انداز میں پوچھ رہے تھے۔ ان کی میز پر کوئی اور بھی آکے بیٹھ چکا تھا۔

”مجھے یہاں کام نہیں کرنا۔“ جھنجھلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اور مجھے تم لوگوں کے مشورے بھی نہیں چاہتے۔“ مجھے معلوم ہے مجھے کیا کرنا ہے اور کہاں کرنا ہے۔ ”کہاں پر زور دے کر بولا۔

”اس ریسٹوران میں کیا برائی ہے؟“ انہوں نے تھمل سے سوال دھرا�ا۔ کشمالة میمین کے ماتھے پہ بل پڑے۔ کان کھڑے ہو گئے۔ اس کے ریسٹوران میں کیا برائی تھی؟ ذرا وہ بھی تو سنے۔

”تم دونوں روپوں جان بوجھ کے میرے ساتھ یہ کر رہے ہو۔ تم لوگ میرے اوپر بھروسہ ہی نہیں کرتے۔ تمہیں لگتا ہے کہ میں پیسے ڈبو دوں گا۔“

”مجھے لگتا نہیں ہے۔ یقین ہے۔“

مالا نے گردن تر چھپی کر کے دیکھا۔

اس کے سامنے ایک نوجوان بیٹھا تھا جس کے گھنگھریا لے بال پونی میں بند ہے تھے۔ کان میں بالی۔ کالائیوں میں بہت سے بینڈز، انگلیوں میں سلورانگوٹھیاں۔ گھننوں سے پھٹی جیز اور اوپر جیکٹ۔ یہاں سے اس کا نیم رخ دکھائی دیتا تھا۔

(ہوں۔ درست لگتا ہے۔) اس نے گردن واپس موڑی اور لیپ ٹاپ پر جھکی۔

”یار پلیز میری بات سمجھو۔ مجھے تمہارے ساتھ ہر روز ایک نئے ریسٹوران کا دورہ نہیں کرنا۔ مجھے کچھ اور بنانا ہے۔“

”کیا؟“

”بیکری۔ ایک بوتیک بیکری۔“

”بیکری کا کیا فائدہ؟“ انہوں نے ناک سے مکھی اڑائی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی گفتگو سنتے ہوئے ٹاپ کر رہی تھی۔

”کیونکہ بیکری میں کیکس بننے ہیں اور کیک کے گرد ساری دنیا گھومتی ہے۔ کیکس خاندان کو جوڑتے ہیں۔ یہ اپنے آگے پیچھے ہر ایک کو اکٹھا کر لیتے ہیں۔ یہ ہر تھواڑہ موضع کی ضرورت ہیں۔ مجھے کیکس بنانے ہیں، یا۔ مجھے کیکس بنانے دو۔“

”بیکری۔“ اس نے چونک کے سراٹھایا۔ ایک خیالِ ذہن کے پردے پہ لہرایا۔ پھر اس نے جلدی سے لیپ ٹاپ اٹھایا اور پچھلی گلی کی طرف بڑھ گئی جہاں سے ایک بیرونی زینہ اور پُرانے تک جاتا تھا۔ ۲ فنڈیبل پہ ایک سرمئی رنگ کا باکس رکھا تھا جس میں اس کی تمام چیزیں پوری آچکی تھیں۔ نخساپا پو دا سب سے اوپر رکھا تھا۔

اس نے ایک لفافے میں بند اتفاقی پردے کے ساتھ رکھا اور مسکرا کے گھرا سانس لیا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔



شم ائیر فونز کانوں میں لگائے نئر کنارے چلتا جا رہا تھا۔ چہرے پہ چھپلا ہٹ تھی اور سردی سے ناک سرخ پڑ رہی تھی۔ دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں کے اندر تھے۔

”ایک سال سے انتظار کر رہا ہوں، سرکار۔ اور کتنا انتظار کروں؟“  
دوسری طرف نگینہ بیگم کی بنسی گونجی۔

”تمہارا لائق اور بے صبری۔ قیچ۔“

اس نے مجھے کمپنی میں گھنے تک نہیں دیا۔ اس کی آفرنہ مانتا تو بیوی کے سامنے برآبنتا۔ وہ بری طرح سے یقی و تاب کھا رہا تھا۔

”تم اس کمپنی میں ضرور گھسو گے اور ایک دن اس کے مالک ہو گے۔ طاقت و عمل شروع ہونے میں وقت لیتا ہے۔“

”ایک سال سے آپ وقت ہی لے رہی ہیں۔ عمل کب شروع ہو گا؟“

”عمل تو شروع ہو چکا۔ کیا تم نے وہ پتھر کا گھوڑا اس کے آفس میں رکھ دیا تھا۔“

”جی۔ ایسی جگہ پر رکھا ہے کہ دن میں کئی دفعہ اس کی نگاہ پڑے۔“ وہ قدرے ٹھنڈا ہوا۔ ”لیکن اس سے کیا ہو گا؟ میری بھیجی گئی کھانے کی چیزیں وہ کبھی نہیں کھاتا کہ میں نے زہرنہ ملا دیا ہو۔“

”سارے جادو کھانے کی چیزوں میں نہیں ہوتے۔ اصل جادو آنکھ سے جسم میں داخل ہوتے ہیں۔“  
وہ کہہ رہی تھیں اور وہ ٹھہر کے پوری عقیدت سے سن رہا تھا۔



(اصل جادو آنکھ سے جسم میں داخل ہوتے ہیں۔)

کافرنس روم کی دیوار پر گلی بڑی اسکرین اس وقت روشن تھی۔ اس پر کچھ اسکچ ابھر رہے تھے۔ طویل میز کے گرد قطروں میں گلی کرسیوں پر بیٹھا فرا دانہاک سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ نوٹس لے رہے تھے۔ کچھ محض سر ہلاتے ہوئے ماہر کون رہے تھے۔

وہ سربراہی کرتی پہ بیٹھا، جھک کے ایک پین سے اسکلپ پن پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اس کی اسکرین کا عکس دیوار پر گلی ایں ای ڈی میں بڑا ہو کے دکھائی دے رہا تھا۔  
اور یہ اسی وقت تھا جب اس کو اپنی گردن پر کسی شے کی موجودگی کا حساس ہوا۔ جیسے کچھ دینگ رہا ہو۔

(نظر میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ آنکھ روح کا دروازہ ہوتی ہے۔ یہ جو دیکھتی ہے، اس کو روح میں اتنا لیتی ہے۔)

ماہر کا ہاتھ تیزی سے گردن کے پیچھے گیا۔ کوئی کیڑا تھا شاید۔ وہ بات روک کے ایک دم اسے جھاڑنے لگا۔ وہ ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے گردن دائیں جانب موڑی۔ ایک بچھو سفید شرٹ کے کالر پر چلتا ہوا کندھے تک رینگ رہا تھا۔ وہ تیزی سے کھڑا ہوا اور زور سے کندھا جھاڑنے لگا۔ وہ اتر کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ دھنٹا وہ کہنی تک

گیا اور پھر غائب ہو گیا۔

”سر، آپ ٹھیک ہیں؟“ آواز پہ وہ چونکا۔ کافرنس روم میں بیٹھے افراد تھیں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک دم سنبھالا۔

”کوئی چیز چھوڑ رہی تھی۔ اینی ویز...“ اس نے سلسہ وہیں سے جوڑتے ہوئے گرافک ٹیبلیٹ پہ نظریں جھکائیں۔

شاید اس کا وہم تھا۔

(وہ ہر روز دن میں کئی دفعاً سحر زدہ مجسم پہ نظر ڈالے گا۔ ہر نظر جادو کو اس کے جسم میں اتارتی جائے گی۔)

وہ کافی شاپ کی قطار میں کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ میں روپ ہوا اخبار تھا میں، کوت میں ملبوس، آفس کے لیے تیار۔ بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتا۔ وہ ہن میں وہ ان تمام پاؤ نٹس کو دھرا رہا تھا جو ابھی آفس پہنچتے ہی اس نے پہلی میٹنگ میں اپنی ٹیم کے سامنے رکھنے شروع کی۔

وہ دفعتاً کسی نے اسے پکارا۔

”ماہر...“

وہ چونک کے مڑا۔ دائیں باائیں دیکھا۔

وہاں کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ اس نے سر جھکا۔

آواز پھر سے سنائی دی۔

”ماہر...“

(جادو اس کے جسم میں اس حد تک داخل ہو جائے گا کہ اسے وہ نظر آنے لگے گا جو موجود نہ ہو۔ وہ سنائی دے گا جو کسی نے کہانہ ہو۔)

”ماہر...“ یہ ایک بھاری مردانہ آواز تھی۔ وہ تیزی سے پٹا۔ حیران نگاہیں اطراف میں دوڑائیں۔

کافی شاپ میں لوگ آ جا رہے تھے۔ گاس ڈور کے باہر اسٹریٹ دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں کوئی کھڑا دروازے سے چہرہ نکالنے اندر جھانک رہا تھا۔ ایک چھوٹے قد کا بچہ جس کا سر گنجنا اور چہرہ سیاہ تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ مسکرا رہا تھا۔

”آپ کی باری آگئی ہے۔“ کسی نے اس کے کندھے پر دستک دی تو وہ چونکا۔ اس سے اگلا کشمکش رانی کافی لیے جا چکا تھا اور باریتا منتظر سی اس کو دیکھ رہی تھی۔ ماہر نے بے اختیار پلٹ کے دیکھا۔ گاس ڈور کے پار اب کوئی نہیں تھا۔

(”اور اس سب سے کیا ہو گا؟“)

”اس کو بہت ناز ہے نا کہ سب اس کا اعتبار کرتے ہیں۔ اب حالات بدل جائیں گے۔ کیونکہ سب سے پہلے اس کا خود اپنے اوپر سے اعتبار ختم ہو گا۔“

وہ اپنے بیڈروم میں سنگھار میز کے سامنے کھڑا تائی باندھ رہا تھا۔ دفعتاً تھوڑی اوپنجی کر کے دیکھا۔ شیو کے دوران گردن پر کٹ لگ گیا تھا۔ نخسا کٹ۔ اس نے اس پر انگلی رکھی۔ خون کا ایک قطرہ انگلی کے پورے کو چھو گیا۔ ماہر نے افسوس سے سر جھکا۔ اور سیدھا باتھروم تک آیا۔ سنک لئے پیچے ہاتھ کیے۔ پانی کی دھار انگلی پر پڑی اور ایک دم وہ دھار شفاف پانی کی بجائے خون میں بدلتی گئی۔ سارا سنک سرخ خون کے ہبھر گیا۔

(پہلے وہ اس سب کو نظر انداز کرے گا۔ لیکن اس کے بعد وہ خوف میں مبتلا ہونے لگے گا۔ اور خوف ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔)

وہ جھٹکے سے پیچھے ہوا۔ خوف سے سامنے لگے آئینے میں دیکھا۔ اس کی گردن اور کالر پر بے تحاشا خون لگا تھا۔ سا گھٹھی ہی گردن میں زور کی تکلیف اٹھی۔ جیسے کوئی گہرا گھاؤ ہو۔ وہ تیزی سے آگے آیا اور نل کھول کے جلدی جلدی پانی چہرے پر ڈالنے لگا۔ پھر نگاہ اٹھائی۔

آئینے میں اس کا عکس صاف تھا۔ کوئی خون، کوئی نشان نہ تھا۔ بس پانی سے اس کا چہرہ اور گریبان بھی گا ہوا تھا۔

اس کی رنگت سفید پڑنے لگی۔ دل زور زور سے دھڑ کنے لگا۔ گردن کا درداب ختم ہو چکا تھا۔

(خوف سحر کو پختہ کرتا ہے۔ جو بتنا ڈرتا ہے، اس پر اتنی جلدی جادو اٹر کرتا ہے۔)

یہ چھٹی کے دن کی ایک خوبصورت صبح تھی۔ وہ کلب کے لاونچ میں صوفوں پر بیٹھا تھا۔ گھٹنے پر ایک کتاب رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سگار دبا تھا۔ وہ اسموکنگ زون تھی اور آس پاس بہت سے لوگ اسموکنگ کر رہے تھے۔ وہ انہاک سے مطالعے میں مصروف تھا جب درق کے کونے پر نہیں سیاہ نگمیں دکھائی دیں۔ پھر ایک بچھوڑینگتا ہوا اور پر آیا۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا۔ کتاب جھاڑی۔ اپنے کپڑے جھاڑے۔ اب بچھوکہیں نہیں تھا۔ اس کا سانس چھولنے لگا۔ انگلیاں کپکپانے لگیں۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ لوگ اس کی طرف متوجہ تھے۔ اس نے کتاب رکھ دی۔ کسی سے نگاہ ملانے بغیر وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

(تم اس کمپنی میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے، میں جب تک وہ اس کا مالک ہے۔ ہمیں اسے وہاں سے نکالنا ہو گا۔)

عمارت کا اکثر حصہ تاریکی میں ڈوبتا تھا۔ وہ اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ ورنہ بیبل پر اپنے سامنے ایک ماؤں سجائئے۔ وہ بہت دھیان سے اس کے کٹڑے جوڑ رہا تھا جب دروازے کے چرچا نے کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر رخ موڑا۔

آفس کا دروازہ دھیرے سے کھلا تھا اور کھلتا چلا گیا۔

”کون ہے؟“ اس نے پکارا۔ آواز میں چوکناپن بھی تھا اور خوف بھی۔

دروازہ دھیرے سے واپس بند ہو گیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور جا کے دروازہ کھولا۔ انگلیوں میں بلکی سی کپکپا ہٹ تھی۔

باہر میں ہال میں اکادمک بیان جل رہی تھیں۔ سب جا چکے تھے۔

وہ واپس اپنی میز تک آیا اور اسکرین روشن کی۔ پھر سی سی ٹی وی کیمروں کی ونڈو کھولی۔ وہاں اس کے آفس کا

منظروں کھائی دے رہا تھا۔ اس نے چند منٹ پہلے کی فوٹج روایا سند کی۔

اس کا روایا آنکھ بن کے اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔ وہ بالآخر دیکھ لے گا کہ کون اسے یوں ڈارا ہے تھا۔ یقیناً یہ کوئی انسان ہے جو اس کو تنگ کر رہا ہے۔

فوٹج میں ماہر فرید کام کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ یکدم اس نے دیکھا کہ وہ اٹھا ہے جا کے دروازہ کھول کے باہر جھانکا ہے اور واپس میز تک آیا ہے۔

وہ سن رہ گیا۔ شش در ساکت۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے خود دیکھا تھا۔ دروازہ کسی نے کھولا تھا۔ آواز آئی تھی۔ لیکن کیمرے جھوٹ نہیں بولتے۔ کیمرے کہہ رہے تھے کہ دروازہ بند ہی تھا۔ اسے وہم ہوا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا ہورہا تھا اس کے ساتھ؟“ اس نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

بک شیف پر کھاسیاہ گھوڑے کی شکل کا بک ہولڈر خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

(اور جو انسان خود پر بھروسہ کرنا چھوڑ دے، اس پر کوئی دوسرا بھروسہ نہیں کرتا۔)

مگیز بیگم نے مسکرا کے وقفہ دیا۔

”ہلال کیسی ہے؟“

سرک کنارے چلتے تھے کا سانس رک سا گیا۔ اس نے تھوک نگلا کر کے سرک کے بارے نہ پوچھا کریں سرکار۔“ اس نے تھی سے بات کائی۔ جواب میں بلکی سی بھی گونجی۔ اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تھے کا چہرہ اب کے سفید پر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ظہیرا پنے آفس میں بیٹھا، بہت سے کاموں میں الجھا ہوا تھا جب اس نے دھپ سے کچھ میز پر رکھا۔ آواز سے وہ ایک دم چونکا۔ پرنٹ آؤٹس ہاتھ سے گر گئے۔ سرا اٹھایا تو وہ سامنے کھڑی اس کو شکایتی نظر وہ سے دیکھ رہی تھی۔

ظہیر نے پہلے تعجب سے اس کے تاثرات دیکھے اور پھر میز پر رکھے باکس کو۔ چند فائلز، فریمز، ایک پودا اور سب سے اوپر ایک لفافہ جس پر جلی حروف میں استغفاری لکھا تھا۔

”یہ سب کیا ہے، مالا؟“

”میں استغفاری دینا چاہتی ہوں۔“

”کیا؟“ وہ حیران ہوا۔ پرنٹ آؤٹ سمیٹ کے پرے رکھے اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”تم اوشن کو بیچ رہے ہو؟“ وہ مشکوک نظر وہ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تمہیں کس نے کہا؟“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ کیا تم اوشن کو بیچ رہے ہو؟“ اس نے دبی دبی آواز میں سوال تلخی سے غصے سے دھرا یا۔ اس کی کٹھے ہوئے بالوں میں چھپی پیشانی پہ بل وہ دیکھ سکتا تھا۔

”میں اوشن کو کیوں بیچوں گا؟“

”یہ بھی میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“

ظہیر نے گھری سانس لی۔ پیچھے ہو کے بیٹھا اور کندھے اچکائے۔

”نہیں۔ ایک آدمی خریدنا چاہتا تھا لیکن پیچھے ہٹ گیا۔“

”یعنی تم اس کو بیچنے کے لیے تیار تھے؟“

”مجھے ڈیڈی کو پیے لوٹا نے ہیں اور اوشن اب تک نقصان میں جا رہا ہے۔ ہمیں کچھ ریٹن نہیں آ رہا۔“ اس نے شیو کھج�ئی اور بات شروع کی۔ ”لیکن میں اس کو نہیں بیچ رہا۔“

”کیونکہ تمہارے پاس کوئی آفر نہیں ہے۔ افر ہوتی تو بیچ دیتے۔ مگر یہ سوچا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی؟ میں نے اس ریستوران کو ایک سال دیا ہے۔“

”اور وہ سال ضائع گیا ہے۔ ہم چاہیں تو ابھی بھی اس میں سے نکل سکتے ہیں۔ میں کچھ بونس دے کر سب کو فارغ کر سکتا ہوں۔“ وہ جیسے اب تھک چکا تھا۔ ”مزید وقت ضائع کرنے سے بہتر نہیں ہے کہ ہم اس سے نکل جائیں؟“

”اگر تم نے اوشن کو بیچا ہے تو ابھی فیصلہ کرو۔ میں استعفی دے دیتی ہوں۔“ اس نے لفافہ باکس سے نکال کے سامنے رکھا۔

”ابھی فوراً تو نہیں...“ وہ گڑ بڑا گیا۔ پھر الجہ بدلا۔ ”دیکھو ہم کچھ عرصہ اس کو چلا کے دیکھ لیتے ہیں۔ اگر...“

”دنیں ظہیر۔ میں اپنا کیریئر مفردوسوں پہ نہیں بنا سکتی۔ میرا ایک سال پہلے ہی ضائع ہو چکا ہے۔ تم میرا استعفی قبول کر کے میرا مزید وقت ضائع نہ کرواؤ۔ یا پھر تم اوشن کو بیچنے کا خیال ذہن سے نکال دو اور مجھے اس کو چلانے دو۔“

ظہیر نے ایک نظر اس کے باکس کو دیکھا۔

”کیا تمہیں واقعی لگتا ہے کہ اوشن کامیاب ہو گا؟“

”اوشن ضرور کامیاب ہو گا اگر تم اس کو وقت دو۔ ہر برس کو سیٹ ہونے میں وقت لگتا ہے۔“ اس کا لمحہ نرم ہو گیا۔ ”اگر اس وقت تم اس کو بچ دیتے ہو تو مجھو ہمارا ایک سال ضائع گیا۔ میں اپنا سال ضائع نہیں ہونے دوں گی۔ میں اس کو کامیاب بناؤں گی۔ لیکن تم مجھ سے پوچھئے بغیر اس کو نہیں پہنچو گے۔“

”نہیں پہنچوں گا، یار۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔“ ظہیر نے آواز نرم کر کے بہت اپنا سیت سے اسے دیکھا۔ ”ہم لوگ اب تک ایک فیملی کی طرح کام کرتے آئے ہیں۔ میں کیوں تمہیں بتائے بغیر ریستوران پہنچوں گا؟ ہرگز نہیں۔ کاظر کٹ سائنس کروالو بے شک۔ لیکن کاغذ کی وہ حیثیت نہیں ہے جو میرے الفاظ کی ہے۔“

”کاظر کٹ کرنا ہوتا تو کرچکے ہوتے۔“ اس کا لمحہ شکایتی تھا البتہ پیشانی کے بل نرم پڑچکے تھے۔ ”فی الحال مجھ پر بھروسہ کر کے دیکھو۔ مجھے ایک سال دو۔ میں نہ صرف اس ریستوران کو کامیاب کر کے دکھاؤں گی بلکہ ہم ایک سال بعد expansion کر رہے ہوں گے۔“

”expansion؟“ ظہیر نے سمجھی سے اسے دیکھا۔ ”کیسے؟“

”بیکری سے۔ ہم ریستوران میں ایک بوتیک بیکری کا اضافہ گے۔ کیونکہ کیس خاندانوں کو جوڑتے ہیں۔ لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کر لیتے ہیں۔“

”بہت دلچسپ۔“ وہ مسکرا یا۔

”میں اپنا استغفاری واپس لے رہی ہوں لیکن اس وعدے پر کہ تم اوشن کو نہیں پہنچو گے اور مجھے ایک نئے برس پلان پر کام کرنے دو گے۔ اگلے سال ہم بیکری بنائیں گے۔“

”میم یہ باکس پھینک دوں؟“ صاعقه اس کی چیزیں واپس میز پر سیٹ کرچکی تو خالی باکس کو دیکھ کے سوال پوچھا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھی کسی سوچ میں گم دکھائی دیتی تھی۔

”نہیں۔ اس کو میری کیبینٹ میں رکھ دو۔“

”اب تو آپ استغفاری نہیں دے رہیں۔ اب اس کی کیا ضرورت؟“ وہ حیران ہوئی۔

مالا نے ایک خاموش نظر اس پر ڈالی۔ سرمنی باکس بھی اس کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

”ہونا چاہیے۔ باکس ہمیشہ ساتھ ہونا چاہیے۔“ وہ زیر لب بڑا ہلکا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب کشمالة مبین کو احساس ہو چکا

تحاک کے ایک دن ظہیر اس کو بتائے بغیر اوشن بیچ دے گا اور اسے اپنا سامان اسی باکس میں ڈال کے یہ جاب چھوڑنی پڑے گی۔



لوگ روم کے وسط میں رکھی سینٹر ٹیبل پر ہی کینڈل رکھی تھی جو اس روز ماہر نے اسے دی تھی۔ ہلال کہنیاں میز پر بچھائے خفگی سے اس کینڈل کو دیکھ رہی تھی۔ شمس پیچھے صوفے پر اجمان مسکراتے ہوئے موبائل پر لگا تھا۔ دفعتاً اس نے سراٹھایا اور محظوظ سے انداز میں رائیل کو مناسب کیا جو اسی وقت کچن سے کافی کامگار اٹھائے آتی دکھائی دے رہی تھیں۔

”ماہر آج کل کچھ اپ سیدھ لگ رہا ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم؟“

”ہلال کو آج اس کے آفس سے لینے گیا تو دیکھا۔ چڑھا اس۔ جیسے خوفزدہ ہو۔“ اس نے مسکراہٹ دبا کے بظاہر چہرے پر حیرت طاری کر لی۔  
”کام کا اسٹریم ہو گا شاید۔“ رائیل کے چہرے پر ابھرنے والی حیرت اصل تھی۔ اور پھر وہ فکرمندی میں بدل گئی۔

”میں اس سے ملنے جاؤں گی۔“

”تمہیں بتائے گا وہ؟ ہونہہ۔“ شمس ہلکے سے ہنسا اور اٹھ گیا۔ اس کے انداز میں استہزا تھا۔ رائیل چپ ہو گئیں۔ سر جھکا لیا۔ پھر ایک دم چونکیں۔ ہلال مڑ کے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے گھنٹر یا لے بال کمر پر پھیلے تھے۔ اور آنکھوں میں اچنچھا تھا۔

”ماہر بھائی کو کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔ دکھاویہ کیا ہے؟“ انہوں نے جلدی سے مسکرا کے تاثرات تبدیل کیے۔ ہلال کا چہرہ قدرے بجھ گیا۔

”ماہر بھائی بیشہ مجھے کینڈل گفت کرتا ہے۔ مجھے نہیں چاہیے ہیں اتنی ساری کینڈلز۔“ وہ خفا خفاسی تھی۔ رائیل مسکرا دیں۔

”پھر تمہیں کیا چاہیے؟“

ہلال کی آنکھوں میں ایک چمک سی عود آئی۔

”نیل پالشز۔ ڈولز۔ چالکلیٹس۔ یونی کورن۔ لاکٹ۔ رنگز۔ بینگز۔“ وہ ایک ہی سانس میں انگلیوں پر گنتی جا رہی تھی اور وہ مسکراہٹ دبائے اسے دیکھے گئیں۔

”لیکن ماہر بھائی مجھے صرف کینڈلز دیتا ہے۔ میں کیا کروں ان کا؟“

”مجھے دکھاؤ۔“ انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور مگ پرے رکھ دیا۔ ہلال نے مجھے دل کے ساتھ کینڈل ان کی طرف بڑھائی۔

انہوں نے ڈھکن کھولا تو موم کی خوبصورتی اپ کے باہر نکلی اور پھیلتی چل گئی۔

رانیل نے ایک نظر سے دیکھا اور دوسری نظر جار میں جبی موم کو جس کے اندر تین سیاہ دھاگے فاصلے فاصلے پر لگتے تھے۔

”کیا تم اب تک نہیں سمجھی ہو کہ وہ تمہیں صرف کینڈلز کیوں دیتا ہے؟“

ہلال کی آنکھیں ایک دم چمکیں۔ اس نے چونک کے ان کو دیکھا۔

”اوہ...“ اس کے لب مسکراہٹ میں ٹھلنے لگے۔



حالیہ دن۔

زیاد کے والدین کا لاہور میں واقع گھر قدرے پرانے طرز بنا بُنگہ تھا جس کو مرمت وغیرہ کرواد کے کافی حد تک میں ٹین رکھا گیا تھا۔ وہ کار سے باہر نکلی اور ایک نظر اس بُنگے پر ڈالی تو ایک عجیب پراسراریت کا احساس ہوا۔ کچھ تھا وہاں جو عام گھروں سے مختلف تھا۔

نگینہ بنگم نے اسے بہت محبت سے گھر بلایا تھا۔ زیاد اسلام آباد گیا ہوا تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ ملا ان کے ساتھ تھوڑی ہیلپ کروادے۔ نگینہ آئٹی ویسے بھی اتنی شفیق، اور محبت کرنے والی تھیں کہ وہ ان کو نہیں کہہ سکتی تھی، گوکہ زیاد سے اسکی بول چال بند تھی۔

اس گھر میں عجیب سی خاموشی تھی۔ پرندوں کی آوازیں تک نہ تھیں۔ وہ پہلے ایک ہی دفعہ یہاں آئی تھی وہ بھی باہر باہر سے چل گئی تھی۔ پہلی بار اندر آرہی تھی۔ کچھ عجیب سما محوس ہو رہا تھا۔

لان خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں درخت نہیں تھے نہ پودے۔ اس نے غور کیا تو احساس ہوا کہ گھاس بھی مصنوعی تھا۔ کوئی گملہ تک نہ تھا۔ صرف ایک درخت تھا جو سوکھ گیا تھا۔ جیسے کچھ تھا فضائیں جو اسے چھلنے پھونے لئے تھیں۔

ظاہر ہے۔ وہ لوگ دنی چلے جاتے ہیں۔ نگینہ بیگم مہینے میں ایک چکر لگاتی ہیں۔ ایسے میں پودوں کا خیال کون رکھے گا۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔

اس نے لکڑی کے میں ڈور پہ باتھ رکھا ہی تھا کہ وہ ایک دم کھل گیا۔ وہ ڈر کے دو قدم پیچھے ہٹی۔

سامنے سیاہ فام سی بنگالی ملازمہ کھڑی تھی۔ اس کی گھورتی ہوئی نظر میں اس کے وجود کے آرپار ہوئیں۔

”بی بی آپ کی منتظر ہیں۔“ وہ اس کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ تھا اس کی نظروں میں جو کشمائلہ نہیں کو غیر آرام دہ کرنے لگا۔ البتہ وہ عادتاً مسکرا دی۔

اندر آئی تو دیکھا، لا و نج میں تاریکی تھی۔ بتیاں بہت مدھم تھیں۔ اور کھڑکیوں کے آگے بھاری پردے تھے جنہوں نے روشنی کا ہر راستہ روک رکھا تھا۔ نگینہ آٹی لا و نج کے تخت پہ بیٹھی تھیں۔ بیمار، نحیف۔ ہمیشہ کی طرح باوقار سا سفید لباس پہنے۔ سر پہ سفید شال اور ٹھلے۔ ان کے قریب ہیٹر جل رہا تھا۔ شاید انورٹ بھی آن تھا کیونکہ وہ گھر اندر سے بہت گرم تھا۔ جیسے دیکھ رہا ہو۔

”مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میری بیٹی میرے گھر آئی ہے۔“ وہ بدققت اٹھ کے اس سے ملیں۔ وہ مسکرا دی اور ان کے پاس وہیں تخت پہ بیٹھ گئی۔ پھر دائیں باائیں دیکھا۔

”آپ نے لائش نہیں جلا رکھیں،“ آج باہر دھند نہیں تھی۔ میٹھی سی دھوپ نکلی تھی۔ لیکن ان گھر کے اندر نہیں تاریک سماحول تھا۔ اندھیرا اور گرمائش۔

”جال رکھی ہیں۔ مجھے ایسے ہی پسند ہے۔“ وہ گاؤں تکیے کے سہارے بیٹھے بیٹھے مسکرا دیں۔ وہ بھی مسکرا دی۔ البتہ کچھ تھا جو اسے غیر آرام دہ کر گیا تھا۔ شاید اسے ماں کی طرح روشنی کی عادت تھی۔ گھروں کو روشن اور ہوا دار کھانا۔ کھڑکیاں کھولنا۔ اور پودے۔ وہ چونکی۔ یہاں اندر بھی پودے نہیں تھے۔ اچھا خیر۔ اسے کیا۔

”زیاد سے بات ہوئی۔ اسے بتایا کہ آج کشمائلہ آرہی ہے تو اندازہ ہوا کہ اسے معلوم نہیں۔“ انہوں نے نری سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”کیا کوئی لڑائی ہوئی ہے تم دونوں کی؟“

”نہیں تو۔“ وہ سنبھل کے مسکرا دی۔ ہر نئے کپل کی طرح یہ اس کا ڈینفس میکنزیم تھا۔ کوئی دوسرا نہ جان پائے کہ

دونوں کے درمیان کیا چل رہا ہے۔

”اس نے بھی بھی کہا۔“ وہ دھیرے سے مسکرائیں۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنے بوڑھے ہاتھوں میں تھامے۔ کشمائلہ نے ان کے ہاتھوں کو دیکھا۔ انہوں نے چاندی کی انگوٹھی پہن رکھی تھی جو پلین تھی۔ سادہ۔ بالکل سادہ۔

”زیاد کو سبیر یہ.. اس کی پہلی مگنیٹر... کی موت نے بہت ڈپریسڈ کر دیا تھا۔ اس کا تو جیسے دل ہی ٹوٹ گیا۔ بہت عرصے بعد وہ سنجلہ ہے اور زندگی کی طرف واپس آیا ہے۔ وہ بھی تمہاری وجہ سے، کشمائلہ۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بہت اپنا نیت سے کہہ رہی تھیں۔ مالا نے سنتے ہوئے سر ہلاایا۔ اسے احساس ہوا کہ اندر انی نامی ملازمہ تخت کے کنارے پر آ کھڑی ہوئی ہے اور اسے گھور رہی ہے۔

”صرف تمہاری وجہ سے اس کی زندگی کی رونق واپس آئی ہے۔ محبت یہ ہوتی ہے۔ جو ٹوٹے دل کو جوڑ دے۔ ایک اچھی عورت اپنی محبت سے اپنے شوہر کے دل کو جوڑ سکتی ہے۔ اس کو اس کے سب مسئللوں سے نکال سکتی ہے۔ اپنی محبت سے اس کی ذات کی ہر کمی کو پورا کر سکتی ہے۔“

اس نے پھر سر اثبات میں ہلا دیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک ان کے ہاتھوں میں تھا۔

”زیاد کی بھی کچھ بری عادات ہیں۔ غصے کا تیز ہے۔ کبھی کبھی تلخ ہو جاتا ہے لیکن دل کا بہت اچھا ہے۔ لیکن تم دیکھنا۔ شادی ہوتے ہی وہ اپنی اس کی پہ بھی قابو پالے گا۔ تمہارا عورت بہت صبر سے اپنے شوہر کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔“

کچھ غیر آرام دہ سا اندر سر اٹھانے لگا۔ اس نے لب کھولے۔ الفاظ ذہن میں جمع ہوئے۔ کیا عورت یہ سب کر سکتی ہے؟ کیا وہ کوئی بری عادات کے چھڑوانے کا اسکول ہے؟ لیکن وہ کہہ جا رہی تھیں۔

”شروع شروع میں اڑ کیوں کوذر اصر کرنا پڑتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مسئللوں کو اگور کرنا پڑتا ہے اور پھر آگے بڑے بڑے سکھ مقدار کا حصہ بنتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی اپنی تمہاری سے زیاد کوہنڈل کر لوگی۔“

اس کے سارے اعتراض دم توڑ گئے۔ وہ درست کہہ رہی تھیں۔ عورت کو ہی گھر بنانا ہوتا ہے۔ عورت کو ہی گھر کو سنجنالنا ہوتا ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور زمی مسکرائی۔

”میں سمجھ گئی ہوں۔“ ذہن نے ایک ریماں نڈ راپنے اندر محفوظ کیا۔ آج وہ زیاد کے متعلق کا جواب دے گی۔ اسے اب ناراضی ختم کر دینی چاہیے۔

اندرانی ابھی تک وہیں کھڑی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

”میرے ساتھ اس کے کچھ ڈاکو منش سنبھال دو۔ اندرانی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ میرے اندراتنی ہمت نہیں ہے۔ جو چیز فالتو ہے اسے ہم پھینک دیں گے۔ اور کام کی چیز رکھ لیں گے۔“

بنگالی ملاز مہ نے سہارا دے کر انہیں وہیل چیز پہ بٹھایا اور وہ دونوں اب ایک لا ببری ہی نما کمرے میں آگئے۔ یہ زیاد سلطان کا اسٹڈی روم تھا۔ کتابوں کے دیوار گیر شیلف۔ فائلز کے ڈھیر۔

”زیاد دہنی میں اکیلا رہتا ہے۔ لیکن شادی کے بعد تم دونوں ہمارے ساتھ رہو گے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“ بنگالی عورت خاموشی سے اس کو کاغذات پکڑا رہی تھی جنہیں وہ الگ الگ کیے جا رہی تھی جب تک نگینہ بیگم نے ایک دم سوال کیا۔

”ہرگز نہیں۔ بلکہ ہمیں تو آپ کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ ورنہ آپ کا خیال کون رکھے گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ایک فائل کو کھول کر سرسری سادیکھا۔ ”یہ کام کی ہے۔ پلاٹ کے کاغذات ہیں۔ اس کو اس طرف رکھ دیں، بوا۔“

بنگالی عورت نے ایک خاموش گھوٹی نظر اس پہ ڈالی اور فائل ایک ڈھیر میں رکھ دی۔ پھر اس نے ایک دوسری فائل اسے تھامی۔ اور ایک نگینہ بیگم کو۔

”زیاد کو اکثر ڈاکو منش کا مسئلہ ہوتا رہتا ہے۔ میں چاہتی ہوں وہ تمام اہم ڈاکو منش اپنے ساتھ دہنی لے جائے۔ اب میری صحت ایسی نہیں رہی کہ بار بار پاکستان آسکوں۔“ وہ کپکپائے ہاتھوں سے ایک فائل کھولے اب عینک سے پڑھ رہی تھیں۔

وہ جواب میں کچھ کہنے لگی۔ تب ہی ایک دم رکی۔ جس فائل کو اس نے اب کھولا تھا اس کے اندر چند کاغذات لگے تھے۔ سب سے اوپر ایک تصویر تھی۔ کسی لڑکی کی جس نے بالوں کی اوپنچی پونی باندھ رکھی تھی۔ اور اس کی آنکھ کے نیچے ہل کا نشان تھا۔

اس نے دو انگلیوں سے تصویر نکال کے پٹھانی۔ سبیرینہ۔

اس کے اعصاب تن گئے۔ ایک ناپسندیدہ سا احساس اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔

”یہ فائل کہاں سے آگئی؟“ نگینہ بیگم نے بہت حیرت سے اسے دیکھا۔ ”میں تو سمجھی تھی کہ اسے عرصہ پہلے پھینک چکی ہوں۔“ انہوں نے ماتھے کو چھووا۔ پھر کھانسیں۔ بنگالی عورت خاموشی سے ملا کو دیکھ رہی تھی جس کی نظریں

فائل پر جھکی تھیں۔

”یہ کس چیز کے کاغذات ہیں؟“

”یہ سبرینہ کی موت کے بعد اس کی فیملی نے ہمیں دیے تھے۔ دیکھ لو کوئی عدالتی کاغذ ہیں شاید۔“ انہوں نے اعلیٰ ظاہر کر دی۔

مالا کی نظر میں کاغذ پر دوڑ گئیں۔

وہ ایک injunction آرڈر (دور رہنے کا عدالتی حکم نامہ) تھا جو سبرینہ کی بہن اور ماں باپ نے عدالت سے حاصل کیا تھا۔

ایک ماہر علی فرید کے خلاف۔

ساری دنیا حکم گئی۔ اس کی پلکیں ساکت تھیں۔

ان الفاظ کی سیاہی ان مٹ تھی۔

ساتھ ہی ایک N16A فارم کی کاپی بھی لگی تھی جسے پُر کر کے انہوں نے عدالت میں جمع کروائے یہ حکم نامہ حاصل کیا تھا۔

”ماہر علی فرید۔“ لب بڑھائے۔ اس نے چونکے انہیں دیکھا۔

”سبرینہ کے والدین نے اس آدمی کے خلاف انجکشن لی تھی؟“ انہوں نے عینک اتاری اور اسے فوٹڈ کرنے لگیں۔ ”اس ایکیڈنٹ میں ایک امیر بوڑھا بھی مارا گیا تھا۔ اس کا ایک نفیاٹی سا بھیجا تھا۔ کچھ عرصہ کسی نفیاٹی امراض کے ہسپتال میں بھی رہا تھا۔ اندر انی میری چائے لے آؤ۔“ ساتھ ہی ملازمہ کو عام سے انداز میں اشارہ کیا۔

”صحیح سے چائے نہیں پی۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔“ پھر اس کا چہرہ دیکھ کے ماتھے کوچھوا۔

”میں بھی دیکھو بات درمیان میں بھول جاتی ہوں۔ کیا کہہ رہی تھی میں؟“

وہ سانس رو کے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”وہ جو نفیاٹی آدمی تھا ... پتہ نہیں کیا نام تھا۔ خیر... فائل میں درج ہو گا....“

(ماہر علی فرید) اس کے لبوں نے بنا آواز کے حرکت کی۔

”وہ آدمی سبرینہ کے پیچھے پڑا تھا۔ کہتے ہیں ایکسٹرنٹ بھی اسی نے کروایا تھا اپنے سوتیلے باپ کو مارنے کے لیے۔ وہ کئی برس سے اپنے باپ کو قتل کرنے کی دھمکیاں بھی دیتا آیا تھا۔ سبرینہ کی موت کے بعد وہ اس کی فیملی کے پیچھے پڑ گیا۔ ان کا تعاقب کرنا۔ ان کو ہراس کرنا۔ وہ لوگ اس سے سخت خوفزدہ تھے۔ اس لیے عدالت چلے گئے۔ اور یوں عدالت نے اس کے خلاف نوٹس دیا۔ تب بھی اس نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ بالآخر انہوں نے ملک ہی چھوڑ دیا۔“

”زیاد... زیاد کو معلوم ہے یہ؟“ اس کی آواز بلکہ تھی اور نظریں اس آرڈر پر جمی تھیں۔

”ہا۔ لیکن میں نے زیاد کو خود ہی روک دیا ان لوگوں کے مسئللوں میں پڑنے سے۔ ہمیں سبرینہ عزیز تھی۔ لیکن اس کی موت کے بعد میں تو ڈر گئی۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اور ایسے نفیاتی انسان کا بھروسہ نہیں ہوتا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ میرے بیٹے کے پیچھے نہ پڑ جائے یا اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔“

”کس نے مارا تھا اس کے باپ کو؟ کیا کبھی معلوم ہو سکا؟“

”نہیں، بیٹا۔ ہم نے اس کپس کے بارے میں خبر رکھنا چھوڑ دی تھی۔ اس فائل کو بھی پھینک دو، کشمائل۔ زیاد دیکھے گا تو اس کا دل برآ ہو گا۔“

لیکن اس نے فائل نہیں پھینکی۔ آہستہ سے اسے گھٹھے کے قریب رکھ لیا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید تھا۔ اور آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔

(وہ سبرینہ کے پیچھے پڑا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ میرے بیٹے کے پیچھے نہ پڑ جائے)

ایک فقرہ بار بار ذہن پر دستک دے رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کیرہ ساداں کے آفس میں اس وقت بیربل فریڈ منہ پھلانے بیٹھا تھا۔ گاہے بگاہے وہ اپنے بھائی کو بھی گھور لیتا جو اپنا اور اپنے کام کا تعارف کروارہتا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے اور میز کی دوسری طرف کیرہ بیگم بیٹھی تھیں۔

”ان کا تعارف نہیں کروایا۔“ انہوں نے مسکرا کے بیربل کو دیکھا۔

”میں...“ بیربل نے لب کھولے جب...

”یہ میرا نس ہے۔ کیرنگنر نس۔“

بیربل کامنہ کھل گیا۔ بے یقینی سے اسے دیکھا جو اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ پھر خنگی سے لب بھنچے اور پیچھے ہو کے

سینے پہ بازو لپیٹ لیے۔

”اچھا لگا آپ سے مل کے ماہر۔ بتائیئے، میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“ انہوں نے کھنکھار کے بالآخر اس کی آمد کا مدعا پوچھا۔ ساتھ ہی وہ مسلسل گردن میں جھولتی سنہری زنجیر کو انگلی پہ لپیٹ رہی تھیں۔

”میں آپ کے پاس برسن کے لیے نہیں آیا۔ کچھ پوچھنے آیا ہوں۔ آپ کی ذاتی زندگی کے بارے میں۔“

”مثلاً؟“ کبیرہ کے چہرے پر تحریر ابھرا۔ قدرے پیچھے ہو کے بیٹھیں۔ پانی کا گاس اٹھا کے لبوں سے لگایا۔

”پیڑی مسح یاد ہے آپ کو؟“

کبیرہ نے آہستہ سے گاس نیچے رکھا۔ ٹشوپ پپر ڈبے سے نکلا اور گاس سے ہاتھوں پہ لگنے والی نبی صاف کی۔

”کون پیڑی مسح؟“

ماہر فرید دھیرے سے مسکرا یا۔ ”میں آپ کو جن نہیں کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ پیڑی مسح کی کلاسٹر رہی ہیں۔ میں یہ بات کئی ماہ سے جانتا ہوں لیکن میں نے آپ کو نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ مجھے لگا کہ آپ میں اور مجھ میں کچھ مشترک نہیں ہے۔“

وہ بالکل خاموشی سے اسے سن رہی تھیں۔ چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ بیربل کو پہلی دفعہ گفتگو میں دلچسپی محسوس ہوتی۔

”کون ہوتا؟“ وہ آنکھیں چھوٹی کر کے اس کو گھور رہی تھیں۔

”میں ماہر فرید ہوں۔ ہلال کا بھائی۔“ اس نے کوٹ کی اندر ورنی جیب میں ہاتھ فرالا اور ایک تصویر یہ نکال کے میز پر کھی۔ کبیرہ نے دو انگلیوں سے تصویر اٹھا کے دیکھی۔ پھر ماہر کا چہرہ۔

”یہ میری بہن ہے اور یہ دو سال پہلے کھو گئی تھی۔“

”پھر.... میں کیا کروں؟“ انہوں نے تصویر میز پر ڈال دی۔ اور ایک نیا ٹشوں نکالا۔

”اس روز مجھے کسی نے احساس دلایا کہ ہم دونوں ایک جیسے ہیں۔ میں سمجھاتا ہوں کیسے۔“ اس کی مسکراہٹ برقرار تھی۔

”آپ کا ایک بیٹا تھا۔ وہ مر گیا تھا۔ سارا خاندان جانتا ہے کہ وہ مر گیا تھا۔ لیکن آپ کہتی ہیں کہ وہ زندہ ہے۔“ اس کی آواز دھیمی ہوئی۔ ”جیسے میں کہتا ہوں کہ میری بہن زندہ ہے۔“

بیربل فرید نے بری طرح چونک کے اسے دیکھا۔ اس کا سانس تک رک گیا۔

”میں سمجھتا تھا کہ آپ denial میں ہیں۔ یا لوگوں کے سامنے اپنا مان رکھنے کے لیے اپنے بیٹے کو زندہ بتاتی ہیں۔ آپ نہیں چاہتیں کہ کوئی آپ پر ترس کھائے۔ آپ سے ہمدردی کرے۔ لیکن اس روز مجھے احساس ہوا کہ.....“

وہ ان کی آنکھوں میں دلکشید ہاتھا۔

”کیا معلوم آپ برسوں سے سچ کہہ رہی ہوں؟“ وہ ہر لفظ توڑ توڑ کے کہہ رہا تھا اور وہ مل نہیں پا رہی تھیں۔

”کیا معلوم آپ کا بیٹا بھی و یے ہی کھویا ہو جیسے ہلال کھوئی تھی؟ اور جیسے کوئی میرا اعتبار نہیں کرتا، و یے ہی آپ پر اعتبار بھی نہیں کیا جاتا۔“

”تمہیں مجھ سے کیا چاہیے؟“ ان کی آنکھوں میں تپش سی تھی۔ غصہ۔ بے بھی۔

”مجھے آپ کی طرف کی کہانی سننی ہے۔ کچھ ایسا جو ہلال کو ڈھونڈنے میں میری مدد کر سکے۔“

”اور میں تمہاری مدد کیوں کروں گی؟ میرا بیٹا مرا ہے یا نہیں، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“

ان کا انداز بے چک تھا۔  
ماہر نے جیب سے ایک کارڈ نکالا اور میر پر کھا۔

”میں اس ہوٹل کے روم نمبر ۵۵۵ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔“ اگلے تین دن میں بھی ہوں گا۔ آپ جب بھی جواب دینے کے لیے تیار ہوں، وہاں آجائیے گا۔“ اس نے پیربل کو اشارہ کیا جو فوراً سے اٹھا اور اس کی وہیل چیز تھام لی۔ وہ جس طرح کی کھاجانے والی نظر وہ ان کو دیکھ رہی تھی، قوی امکان تھا کہ وہ جلد ہی کہہ دے، دروازہ اس طرف ہے۔

”یہ شوپنگ سے ہاتھ کیوں صاف کر رہی تھی؟ کیا اس کو اوتی ڈی ہے؟“ لفت کی طرف جاتے ہوئے پیربل نے سوال کیا۔

”نہیں۔ یہ اوتی ڈی نہیں ہے۔ وہ ظاہر کرتی ہے کہ اسے اوتی ڈی ہے۔ درحقیقت انسان جب بہت سے لوگوں پر جادو کرو اچکا ہو تو اس کو خود پہ جادو ہونے سے خوف آنے لگتا ہے۔ وہ کسی کا دیا تخفہ قبول نہیں کرتا۔ کسی سے لے کر کچھ نہیں کھاتا۔ ہر چیز بار بار صاف کرتا ہے کہ کہیں کسی نے پھونک نہ مار دی ہو۔ ایک بال بھی گرجائے تو اس کو خوف آتا ہے کہ کوئی اس پر جادو کر دے گا۔ جادو کروانے والے ساری عمر اپنے اسی خوف میں رہتے ہیں۔“

”کیا وہ اپنی کہانی سنانے آئے گی؟“ پیربل کو اچنچھا ہوا۔ اسے ماہر سے اتنی جلدی وہاں سے چلنے کی توقع

نہیں تھی۔

”وہ ضرور آئے گی۔“

”تمہیں کیسے معلوم؟“

”کیونکہ آج تک ہر کوئی سمجھتا آیا ہے کہ کبیرہ اپنے بیٹے کے زندہ ہونے کے بارے میں جھوٹ بولتی ہے۔ میں وہ واحد انسان ہوں جس نے اس کی بات پا اعتبر کیا ہے۔ وہ مجھ سے ملنے ضرور آئے گی۔“

”اور تم بس اسی کے لیے اس شہر میں ٹھہرے ہوئے ہو؟ اور کوئی کام نہیں ہے تمہیں؟“ وہ اس کی وہیل چیز دھکیلتے ہوئے ناراضی سے بولا تھا۔ ماہر نے جواب نہیں دیا۔

”کبیرہ بیگم سے ملنے میں سارے کام چھوڑ کے آیا تھا؟ ہونہے۔“ وہ زیرِ لب بڑا بڑا یا۔

”تم کام بھی کرتے ہو؟“ وہاں سدا کی بے نیازی چھائی تھی۔ اور اس لمحے بیرون فرید نے تمہیہ کیا کہ وہ اپنے بھائی سے مزید کام نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ برادر کا بدلہ لے گا۔

اور اس وقت وہ اس سے صرف ایک طریقے سے بدلہ لے سکتا تھا۔ کچھ سوچ کے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

واپسی پر سارا راستہ ماہر خاموش تھا۔ البتہ بیرون مسکراہٹ دبائے موبائل پر جھکا تھا۔ اس نے انٹاگرام کھول رکھا تھا۔ سامنے کشمالة مبین کی آئی ڈی کھلی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس نے میتھیخ کا بٹن دبایا۔

”میرا بھائی اس وقت لا ہور کے اس ہوٹل میں رہائش پذیر ہے۔“ ہوٹل کا نام لکھ کے وہ ٹانپ کر رہا تھا۔ ”وہ آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہے۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو کچھ دیر کے لیے اس کی بات سن لیں۔“

میتھیخ بھیج کے اس نے اسکرین شات لیا اور اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ وہ جانتا تھا کشمالة اس کا میتھیخ نہیں دیکھے گی۔ نہ سے جواب دے گی۔ نہ وہ ماہر سے ملنے آئے گی۔ لیکن اس اسکرین شات کو دیکھ کے ماہر کے تاثرات کیا ہوں گے۔ اسے سوچ کے مزہ آنے لگا۔ لیکن ابھی نہیں۔ وہ اتنبول جا کے ہی اس کو یہ دکھائے گا تاکہ فوراً سے گھر سے غائب ہو سکے اور.....

میتھیخ ٹون نے اسے چونکا یا۔ اسکرین کو دیکھا تو لب بے یقینی سے کھل گئے۔ وہاں کشمالة مبین لکھا نظر آرہا تھا۔ بیرون کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ اس کو اندازہ نہ تھا کہ وہ اس کی میتھیخ ریکوئیٹ اتنی جلدی دیکھ لے گی۔

”کیا تمہارا بھائی شام سات بجے کے بعد وہیں ہو گا؟“

اس نے گڑبرڈ کے ماہر کو دیکھا جو بے خبر سا باہر دیکھ رہا تھا۔ پھر اسکرین کو۔  
”لیں۔“ اب وہ مسکر انہیں رہا تھا۔ بے اختیار انہیں خنوں سے دانت کرنے لگا۔  
یا اس نے کیا کیا؟ ماہر اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اودہ نو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

”آئی ایم سوری۔“ زیاد کی آواز ساعتوں میں سنائی دی اور اس کا سارا غصہ دھیرے دھیرے غائب ہونے لگا۔ وہ گلینہ آنٹی کے گھر سے واپسی پا بھی ٹریفک کے رش میں تھی جب زیاد کا میتھ آیا۔ بہت دنوں بعد وہ کھل کے مسکرائی۔ تبھی اس کی کال بھی آنے لگی۔ اس نے کار فون کا اسپیکر آن کر دیا۔

”مجھے تم پہ غصہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم چاکلیٹس نہیں کھاتیں۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔“

”مجھے بھی آپ کا تھفا اتنی لاپرواہی سے کسی اور کوئی نہیں دینا چاہیے تھا۔ آئی ایم سوری ٹو۔“ وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔  
موڑ ایک دم بہتر ہو گیا تھا۔ اتنے دن سے جو وابہے دل کو ستانے لگے تھے وہ ایک دم سے غائب ہو گئے تھے۔

”ہم چند دن بعد ایک ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہیں۔ ہمیں ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر موڑ نہیں خراب کرنے چاہیے۔“

”آپ کو بھی چاہیے کہ آپ ہمیشہ مجھ سے عزت ہے یا بات کریں۔ عزت محبت سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔“

”محبت میں ناکوئی انا، کوئی سیلف رسپیکٹ، کوئی باوڈری غیبی ہوتی، کشمائلہ۔ میاں بیوی کے درمیان بہت سی لڑائیاں ہوتی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ اہم یہ ہے کہ ہم ہر دفعہ ایک دوسرے کو منایا کر لیں۔“

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، پھر فون واپس کی توجہ بھکھلی۔ موبائل اٹھا کے دیکھا تو پیر بل فرید لکھا آرہا تھا۔

”میں آپ کو گھر پہنچ کے کال کرتی ہوں۔“ اس نے کال بند کی۔ چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ وہ لب بھنچے، شکن آسودہ پیشانی کے ساتھ تیز تیز ماض کرنے لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہوٹل کی لابی سیاہ سفید ٹائلز سے مزین تھی۔ فاصلے فاصلے پہ مخلیں صوفے رکھ کے چھوٹے چھوٹے شنگ ایریا ز بنائے گئے تھے۔ اس شام وہاں اتنا راش نہ تھا۔ کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ اٹھ کے جا رہے تھے۔

ماہر بھی ایسے ہی ایسے ہی ایک صوفے پر راجمان تھا۔ سفید ڈریس شرٹ پہنے، کف موڑے، وہ پیر لمبے کر کے

مخلیس اتو من پر کھے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں کتاب تھی جسے وہ اونچا اٹھائے پڑھنے میں مصروف تھا۔ دفتار اسے محسوس ہوا کہیر بل دائیں بائیں ٹھیل رہا ہے۔ کبھی بیٹھ جاتا۔ کبھی اٹھ کے چلنے لگتا۔

”انتنے بے چین کیوں ہو؟“ ماہر نے کتاب کا کونا موڑ اور ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔  
”نہیں تو۔“ وہ فوراً سے قریب میں بیٹھ گیا۔

”پیسے چاہیے ہیں؟“ غور سے اسے دیکھا۔

”دنیا پیسے سے شروع ہو کے پیسے پخت نہیں ہو جاتی، ماہر بے۔“ وہ چڑ گیا۔  
”تمہاری ہو جاتی ہے۔“ بے نیازی سے واپس کتاب پڑھنے لگا۔

اور یہ وہی لمحہ تھا جب ایک احساس نے دستک دی۔ کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ دور سے۔ ماہر فرید نے کتاب نیچے کی۔

سیاہ سفید شترنج کی بساط جیسے فرش پر دور سے وہ چلی آرہی تھی۔

وہ جسے وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

کتاب خود بخود نیچے ہوتی ہوئی صوفی یہ جا ٹھہری۔ اس نے تیزی سے پیروں نیچے کیے۔ بیساکھیاں قدموں میں رکھی تھیں۔ نامحسوس انداز میں ماہر نے پیروں سے انہیں صوفی کے نیچے دھکلایا۔ اور بدقت اپنے قدموں پر کھڑا ہوا۔  
نگاہیں اس پر جھی تھیں۔

وہ میرون لمبی قمیض پر بھوری لیدر جیکٹ پہنے ہوئے تھی۔ دو پٹھے گردن میں فالی کے دونوں پلوسے منے گرائے ہوئے تھی۔ بال آدھے دائیں کندھے پر اور باقی آدھے پیچھے گر رہے تھے۔

وہ اسی کو دیکھتی اس طرف آرہی تھی۔ کسی غلطی سے نہیں۔ اتفاق سے نہیں۔ اس کی آنکھوں سے گلتا تھا کہ وہ اسی سے ملنے آتی ہے۔

مگر کیوں؟ کیسے؟

ماہر نے چونک کے بیرون کو دیکھا۔ ذہن نے دونجع دو کیے۔

”کیا کیا ہے تم نے؟“ وہ دبی آواز میں غرایا۔ بیرون مزید فاصلے پر سرک گیا اور چہرہ ایسے موڑ لیا جیسے اسے پہچانتا تک نہ ہو۔

وہ اب تک قریب آچکی تھی۔

”کشمالة...“ اس نے تھوک نگلا۔

”کیف...“ وہ سپاٹ سی لگ رہی تھی۔ اس کے عین مقابل آ کر کی۔

”بیٹھو،“ اس نے سامنے رکھے سنگل صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ٹانگ پہ زور ڈالے ہوئے تکلیف شروع ہونے لگی تھی۔

”میں زیادہ دیر بیٹھنے نہیں....“

”بیٹھو،“ وہ قدرے زور سے بولا۔ ضبط سے مٹھی بچھنی لی۔ چہرے پہ تکلیف تھی۔ وہ زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا اور اس کے بیٹھنے سے پہلے بیٹھنے نہیں سکتا تھا۔

”تم مجھ سے مانا چاہتے تھے؟“ وہ سنجیدگی سے کہتی سامنے بیٹھی۔ ماہرنے واپس بیٹھتے ہوئے فرصت سے بیربل کو دیکھا۔

”یقیناً میرے بھائی نے....“

”اوہ میں اس کا بھائی نہیں ہوں۔ میں ایک کمیر نیکر نرس ہوں۔ صرف نر۔“ وہ طفر سے کہتا ایک دم اٹھا اور ہونہہ میں سر جھکلتا آگے بڑھ گیا۔ ماہر نے بہت ضبط سے اسے دور جاتے دیکھا۔ اس کی خبر وہ بعد میں لے گا۔ اب وہ اس کی طرف متوجہ ہوا جو سے ہی دیکھ رہی تھی۔

کہاں سے بات شروع کرے؟

بات ختم کہاں ہوئی تھی؟

”تمہاری امی کے لیے...“ الفاظ ادھورے چھوڑ دیے۔ ”آئی ایم سوری۔“

”شکریہ۔ تین ماہ ہو گئے اس بات کو۔“ اس کے انداز میں کچھ جتنا تا ہوا ساتھا۔

”میں آنا چاہتا تھا لیکن....“ اس کی نظریں اپنے قدموں پہ جھکی۔ نامحسوس انداز میں بیساکھی مزید پیچھے دھکیلی۔ ”لیکن کچھ کام میں پھنس گیا تھا۔“

”آن چاہیے تھا۔ ماں سے اتنا تعلق تو تھا تمہارا۔“ اس کی آواز میں گلہ تھا۔ غصہ بھی۔

ماہر نے استجواب یہ ابر و اٹھائے۔

”اوہ۔ یعنی تم نے میرا انتظار کیا۔“

”میں کیوں انتظار کروں گی؟ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ لیکن معید اور ماہی سے تو تمہارے اچھے تعلقات ہیں۔“ اچھے

پر زور دیا۔

ماہر نے کندھے اچکائے۔

”کیونکہ وہ دونوں سپنس ابھل ہیں۔ دل سے نہیں دماغ سے سوچتے ہیں۔ جلد معاف کر دیتے ہیں۔“  
وہ چند لمحے اسے گھورتی رہی۔ آنکھیں چھوٹی کر کے جیسے اس کی روح کے اندر اترنا چاہ رہی ہو۔ کچھ تھا جو اس  
کے انداز میں نیا تھا۔ جیسے کسی بات کا نیا غصہ ہو۔

”میں نے بھی کوشش کی۔ تمہیں معاف کرنے کی۔ تمہارا یقین کرنے کی لیکن ہر دفعہ تمہارا ایک اور فریب سامنے  
آ جاتا ہے۔ ماہر فرید کی ذات کا ایک اور خفیہ پہلو۔ اور بس۔ سب ختم ہو جاتا ہے۔“

”ویری انٹرستنگ۔ یعنی تم میرا یقین کرنے کی کوشش کرتی ہو؟“ اس نے گزرتے ہوئے ویٹر کوا شارہ کیا۔  
”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں صرف بات کرنے آئی ہوں۔“ وہ فوراً سے بولی۔

”جانتا ہوں۔ اپنے لیے منگوار ہاہوں۔“ بے نیازی سے قریب آئے ویٹر کو دیکھا۔

”میری ریگولر کافی۔“ اس کا اندازاب سپاٹ ہو چکا تھا۔ وہ بھانپ چکا تھا کہ وہ ایک دفعہ پھر کوئی نئی فرد جرم لے  
کر آئی ہے۔

”اس دفعہ کیا کیا ہے میں نے، کشمکش بی بی؟“  
چیچھے کوٹیک لگائی اور ایک بازو صوفے کی ٹیک پہ پھیلا لیا۔ ایک ٹانگہ دوسرا پہ جمالی۔ یہ کم تکلیف دہ پوچھ رہا۔  
”تم نے کہا تم اپنی بہن کو ڈھونڈنے کے لیے میری زندگی میں آئے تھے۔ اور میں اس بات پر یقین کرنے لگی تھی  
کہ...“ اس نے ایک کاغذ جیکٹ کی جیب سے نکال کے اس کے سامنے کیا۔

ماہر نے ہاتھ بڑھا کے کاغذ لیا اور اس کی تہیں کھول کے دیکھا۔

”یاد ہے یہ کیا ہے؟“

”یاد ہے ایک دم ہنس پڑا اور کندھے اچکائے۔“ ایک طرح کا *restraining injunction* آرڈر۔ یہ جس  
زمانے کا ہے، تب بہت سے لوگوں نے میرے خلاف ایسے کورٹ آرڈرز لیے تھے۔“  
”مگر وہ نہیں بنی۔ وہ اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔“

”یہ سرینہ کی فیملی نے لیا ہے۔ وہ لڑکی جو تمہارے سوتیلے باپ کے ساتھ ایکسٹرناٹ میں ماری گئی تھی۔“

”ہا۔ ان دونوں بہت سے لوگوں کو مجھ سے خطرہ تھا۔“ وہ پھر سے ہنس دیا۔ ”کیا تم نہیں جانتیں؟ میں ایک

سائیکو پتھر مشہور ہوں۔ استنبول، دوہا، لندن..... جہاں جہاں میں رہا ہوں، وہاں سب جانتے ہیں۔۔۔“ اس کے انداز میں ڈھنائی تھی۔

”تم اس لڑکی کے گھروالوں کو ہراس کر رہے تھے؟“

”ویل...“ اس نے کندھے اچکائے۔ ”میں اس کو ہراس منٹ نہیں کہوں گا۔ میں صرف..“ کھنکھارا۔ ”کچھ سوالات پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ بر امان گئے۔ کسی کے خلاف injunction لینا لندن میں عام تی بات ہے۔“ مسکرا کے کاغذ میز پر رکھا۔

”اس میں فریب کیا ہے؟“

”سبرینہ زیاد کی مگنیٹر تھی۔ اور تم اس کا تعاقب کر رہے تھے جیسے میرا تعاقب کرتے تھے۔“ چند لمحے کے لیے وہ کچھ بول نہیں سکا۔ پھر ایک دم بازو نیچے کیا اور نانگ نانگ سے ہٹا کے سیدھا ہو بیٹھا۔ کاغذ دوبارہ کھول کے دیکھا۔ اس کی رنگت بد لئے گئی۔

”تم کچھ بھی اپنی بہن کے لیے نہیں کر رہے تھے۔ تم یہ سب زیاد کی وجہ سے کر رہے تھے۔ تم ہمیشہ مجھے زیاد کے خلاف کرتے تھے۔ تمہیں اس سے ٹایکوئی ذاتی مسئلہ ہے، کیف۔ میں سمجھتی نہیں سکی۔ تم میری زندگی میں تب آئے جب زیاد میری زندگی میں آیا۔ تم زیاد سے جزیی ہڑکی کا پیچھا کرتے ہو۔ یہ ہے تمہارا اور میرا کنیکشن جسے میں پہلے سمجھنہیں سکی۔“

وہ ابھی تک اس کا گذ کو پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے چونک جانے والے انداز میں چڑھا اٹھایا۔

”نہیں۔“

”کیا تم...“

”نہیں۔ سبرینہ زیاد کی مگنیٹر نہیں تھی۔“ وہ تیزی سے بولا۔

مالا نے گھری سانس لی اور پیچھے کو ہو کے بیٹھی۔ بازو سینے پر لپیٹ لیے۔ آنکھوں میں بس افسوس تھا۔

”ہر دفعہ یہی ہوتا ہے۔ تمہارا ایک نیا فریب کھلتا ہے اور میں اسے تمہارے سامنے رکھتی ہوں تو تم نہ جانتے کی ادا کاری کرتے ہو۔ جیسے تم نے میرا ریستوران نہیں خریدا۔ جیسے تم نے کیف کو دھمکایا نہیں۔ جیسے تم جانتے ہی نہیں کہ سبرینہ زیاد کی مگنیٹر ہے۔“

”سبرینہ کی کسی سے منگنی نہیں ہوتی تھی۔ اگر زیاد اس کو اپنی مگنیٹر کہتا ہے تو وہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ اس کا انداز

قطعی تھا۔

”تم ہمیشہ مجھے زیاد کے خلاف کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ تم میری ماں کی موت پر نہیں آئے لیکن تم زیاد اور میری شادی سے چند دن پہلے یہاں آگئے ہو۔ تم زیاد سے کسی چیز کا انتقام لے رہے ہو شاید۔ کیا مسئلہ ہے تم دونوں کا؟“

”اوہ....“ اس کے لب اوہ میں سکڑ۔ ایک افسوس بھری سانس خارج ہوئی۔

”اسی لیے تم یہاں آئی ہو۔ تمہیں ڈر ہے کہ میں تمہاری شادی نہیں ہونے دوں گا۔ یا کوئی مسئلہ پیدا کروں گا۔“ اب کے وہ مسکراہٹ میں اذیت تھی۔ اداسی تھی۔

”تم واقعی مجھے نہیں جانتیں۔ چج۔“ افسوس سے سرفی میں ہلا�ا۔

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ...“

”اب تک میں تمہاری سنتا آیا ہوں۔ اب میری سنو۔“ وہ آگے کو جھکا اور غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”میں نے تمہیں یہاں نہیں بلایا۔ تم خود آئی ہو۔ کیونکہ تم مجھ سے خوفزدہ ہو۔ حالانکہ تمہیں اس شخص سے خوفزدہ ہونا چاہیے جس سے تم شادی کرنے جا رہی ہو۔ وہ ایک نارسیست، فریب کار اور جھوٹا انسان ہے۔ وہ تمہیں ہرٹ کرے گا، کشمالة۔ اور وہ تمہیں بہت ہرٹ کرے گا...“

وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔

”لیکن میں تمہیں اس سے شادی سے منع نہیں کروں گا۔ یہ تمہاری غلطی ہے۔ تو میں تمہیں تمہارے حصے کی غلطی کرنے دوں گا۔ کیونکہ یہ میرا مقام نہیں ہے کہ میں کسی کے فیصلے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کروں۔ تم جس سے بھی شادی کرو، مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اور میں تمہیں سمجھاؤں گا بھی نہیں۔ کیونکہ ابھی تم کچھ نہیں سمجھو گی۔ تمہارے اوپر زیاد سلطان کا spell (جادو) چڑھا ہوا ہے۔“ وہ نئی سے مسکرا یا۔

”محبت جاؤ نہیں ہوتی۔“ اس کا چہرہ سرخ ہوا۔

”curse کہہ لو۔ اور یہ curse تمہیں کچھ سننے نہیں دے گی۔ اس لیے میں تمہیں نہیں روکوں گا۔“

لیکن....“ اس نے مٹھی بند کی اور انگوٹھا نکال کے اوپر کیا۔

”پہلی بات... سب رینہ زیاد کی میگیتر نہیں تھی۔ زیاد نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔“

”وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔ سارا خاندان جانتا ہے وہ اس کی منگیتر تھی۔“

”دوسری بات...“ اس نے زور دے کر کہا جیسے اس کی بات سنی نہ ہو۔ اور ایک انگلی مزید بند مٹھی سے نکالی۔

”میں تمہاری زندگی میں اپنی بہن کے لیے آیا تھا۔ غلط کیا۔ بہت غلط کیا اور یہی میری سزا ہے۔ لیکن میں اپنی بہن کے لیے ہی آیا تھا۔ اور گوکر میں جانتا ہوں کہ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ بلکہ ماہ بینہ کچھ جانتی ہے جو میری مدد کرے گا۔ اسے خود بھی نہیں معلوم کہ کیا ... لیکن وہ کچھ جانتی ہے۔ اور یہ الگ ہے۔ وہ میری مدد شاید کر سکے۔ شاید نہ کر سکے۔ لیکن ...“

اس کی آواز مدمم ہوتی۔ ایک سرگوشی کے جیسی۔

”ایک بات میں جانتا ہوں۔ پہلے دن سے ... جب میں نے تمہاری نوکری کی تھی۔ اور میں نے آج تک کسی انسان کی نوکری نہیں کی، کشمائل۔ صرف تمہاری کی۔ میں نے کسی کی گاڑی کے دروازے نہیں کھولے۔ سوائے اپنے باپ کے۔ لیکن تمہارے لیے میں نے سب کچھ کیا۔“

”Mighty Mahir Farid“ وہ بڑا بڑا۔

”کیونکہ میں پہلے دن سے جانتا تھا کہ تم میری بہن کو ڈھونڈ سکتی ہو۔ صرف تم۔ میں بھی انسانوں کے بارے میں غلط نہیں ہوتا۔ اس کو اس بھویا وجہان۔ میں تب بھی جانتا تھا اور اب بھی۔ تم میری بہن کو بچا سکتی ہو۔“

وہ جہاں تھی، وہیں ٹھہر گئی۔ انکھیں حیرت سے چھوٹی ہوئیں۔ اسے اس بات کی توقع نہیں تھی۔

”تم ہلال کو نہیں جانتیں۔ لیکن پھر بھی تم اس کو ڈھونڈ سکتی ہو۔ صرف تم۔“

وہ اس کی انکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ پہلی دفعہ اسے لگا ماہر کی بھوری انکھوں میں کچھ گلابی سا بھرا تھا۔

گلابی نبی۔

وہ پلک نہیں جھپکا سکی۔ ویژنے کب کافی لا کے سامنے رکھی، ان دونوں کو علم نہ ہو سکا۔

”ہلال اس اکتوبر گیارہ سال کی ہوتی ہوگی۔ وہ بہت ... بہت پیاری ہے۔ بہت اسماڑ۔“

وہ ابھی تک اس کی انکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ہاں وہ نبی تھی۔ اس کی آواز میں بھی وہی نبی تھی۔ گیلا سا کچھ۔

”تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ جانتا ہوں۔ کرتی رہو۔ ساری عمر کرتی رہو۔ لیکن تم ہلال کو نہیں جانتیں۔ وہ بہت پیاری ہے۔ وہ میری زندگی میں آنے والی سب سے بڑی خوشی ہے۔ اور وہ مجھ سے کھو گئی ہے۔ کیونکہ میں اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکتا تھا۔ میں نے خوف کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ تم نہیں جانتیں کشمائل مبین، کہ وہ وقت کیسا ہوتا ہے جب انسان کو وہ آوازیں سنائیں دیں جو ہوتی نہیں ہیں۔ وہ چہرے دکھائی دیں جو وہ جو نہیں رکھتے۔“

مالے بھر کے لپے پلک جھپکنا بھول گئی۔

”وہ میری وجہ سے کھوئی تھی۔ لیکن وہ مری نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے۔ اور وہ کہیں چھپی ہوئی ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ میں یہاں محسوس کر سکتا ہوں۔“ اس نے سینے پر انگلی رکھی۔ پانی ابھی تک اس کی آنکھوں میں تھا۔ وہ پلک تک نہیں جھپک پا رہی تھی۔

”اس کو مدد چاہیے۔ میری مدد۔ تمہاری مدد۔ وہ اکیلی ہے۔ لیکن وہ خوفزدہ نہیں ہے۔ وہ بہت بہادر ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ ہلال اور میں ایک دوسرے کو ڈھونڈ لیں گے۔ لیکن...“ اس نے ناک سے گلی سانس اندر کھینچی۔ ”لیکن میں تم سے صرف ایک بات چاہتا ہوں۔“ اس کے لبھ میں منٹ تھی۔ وہ واقعی پلک تک نہیں جھپک پا رہی تھی۔

”صرف ایک بات۔ تمہیں جب بھی موقع ملے، جب بھی...“ اس نے زور دیا۔ پھر سے ناک سے گلی سانس اندر کھینچی۔ ”تو تم ہلال کی مدد ضرور کرو گی۔ ہلال وہ فاختہ ہے جس میں میری جان ہے اور تم اس کو اس جادو گر کی قید سے ضرور نکالو گی۔ میرے کیے کی سزا تم ہلال کو نہیں دو گی۔ کیا تم میرے لیے صرف اتنا کر سکتی ہو؟“  
وہ خاموش ہوا۔ پھر گھرے سانس لیتا ہاں میں طرف دیکھنے لگا۔ آنکھیں جھپکائیں جیسے نبی کو گرنے سے پہلے واپس اندر کھینچنا چاہتا ہو۔

"میں نے تمہارے کیسے کی سزا تمہیں نہیں دی تو اس کو کیا دوں گی؟" اس نے خود کو کہتے سنا۔ وہ ابھی تک اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کیف کی آنکھوں کو ایسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”اگر تم مجھے ہلال سے ملائکوتو میں بد لے میں تمہارے لیے وہ کروں گا جو تم چاہتی ہو۔“

ملا کے ابر واچھنے سے بچنے کوئی فسوس ساٹو ٹا۔

”ناں ناں کشمالة بی بی۔ ناں۔“ اس نے ایک دم ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ ”ہم انسان ہیں۔ ہم سب کو ایک دوسرے سے کوئی کام پڑ سکتا ہے۔ کبھی نہ کبھی۔ زندگی میں تمہیں مجھ سے کچھ چاہیے ہو گا۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم جو کہو گی، میں وہ کروں گا۔ کوئی بھی ایسا کام جو ممکن یا ناممکن ہوئ پیسے سے ہو یا ہاتھوں کی کوشش سے، میں اسے کروں گا چاہے اس کے لیے مجھے کوئی بھی قیمت کیوں نہ داکرنی ہو۔“

”مجھے کبھی تمہاری ضرورت نہیں پڑے گی۔“ وہ دھیرے سے کہتے ہوئے اٹھی۔ بیگ اٹھا کے کہنی پر رکھلیا۔ ایک

آخری نظر اس پر ڈالی۔

”میں زیاد کے ساتھ خوش ہوں۔ اور صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم مجھے سکون سے میری نئی زندگی شروع کرنے دوں۔“

ماہر نے سر کو اثبات میں خم دیا۔ ملاقات ختم ہو چکی تھی۔ وہ پلٹی اور آگے بڑھنے تجویز کی پیچھے سے بولا۔

”سرینہ زیاد کی مغناطیس نہیں تھی۔ چاہو تو سرینہ کی فیملی سے پوچھ لو۔“ اس نے عقب سے پکارا اور کتاب اٹھا لی۔ مala کے قدم لمحہ بھر کے لیے زنجیر ہوئے لیکن پھر وہ آگے بڑھنے تھا۔ اسے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھنا تھا۔ وہ نمک کا مجسمہ بننے کا خطرہ نہیں مولے سکتی تھی۔

لفٹ کے دروازے کھلے اور وہ اندر داخل ہی ہوئی تھی کہ کوئی اس کے ساتھ سوار ہوا۔ اس نے مال کے فلور کا بٹن دبایا اور گردان موڑی۔ بیربل فرید ساتھ کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کے مسکرا یا۔

”ہیلو۔“

اس نے سر کو اثبات میں خم دیا اور سینے پر بازو لپیٹے سامنے دیکھنے لگی۔ دھاتی دروازوں میں ان دونوں کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

”ماہر نے آپ کو یہاں نہیں بلا�ا تھا۔ میں نے بلا�ا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ آپ لوگ مل کے بات کر لیں۔“

”جانتی ہوں۔“ اس نے ہنکھیوں سے اس کا عکس دیکھا۔ اس نے اس نوجوان کو کہیں دیکھ رکھا تھا۔ پچھلی دفعہ بھی یہی لگا تھا۔ شاید گزرے برسوں میں کہیں دیکھا ہو۔ اسے یاد نہ تھا۔

”آپ کو شادی کی مبارک ہو۔ اور ہماری پرواہ مت کریں۔ ہم دونوں بس اپنی بہن کو ڈھونڈ لائے ہیں۔“ اس نے کچھ نہیں کہا۔ لفت اور پر جاری تھی۔ چند لمحے خاموشی سے کئے۔

”کیا وہ بیمار ہے؟“

بیربل چونکا۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔

”بیمار؟“

”وہ تکلیف میں لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر زخم کا نشان بھی تھا۔ کچھ ہوا ہے کیا؟“ اس کی آواز دھیمی تھی۔

”اس کا ایک سیڈنٹ ہوا تھا۔ آپ کی امی کی ڈیتھ کے دنوں میں۔ وہ پاکستان آنا چاہتا تھا لیکن آنہیں سکا۔ اس کی

ٹانگ بہت بڑی طرح ٹوٹ گئی ہے۔ اب بھی وہ ہلال کی وجہ سے یہاں آیا ہے۔ کسی... کسی سے ملنا تھا نہیں۔“  
مالانے بس سر ہلا دیا۔ کہا کچھ نہیں۔ لفت کے دروازے کھلے۔

”لیکن وہ تکلیف میں نہیں ہے۔“ وہ باہر نکل رہی تھی جب بیربل پیچے سے بولا۔  
اس نے نسبتی سے اسے دیکھا۔

”کیونکہ تکلیف میں ہونے کے لیے انسان کے سینے میں دل کا ہونا ضروری ہے۔ اور ماہر بے ایک رو بوب  
ہے۔ دل وغیرہ نہیں ہے اس کا۔“ بیربل نے مسکرا کے کندھے اچکائے۔  
اور وہ ایک دم نہس دی۔ پھر کچھ کہے بنا آگے بڑھ گئی۔  
وہ اسے دور جاتے دیکھتا تھا۔

اگلے چند گھنٹے کے لیے اسے غائب ہو جانا چاہیے تھا۔ فی الحال وہ ماہر کا سامنا کرنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ گھر آئی تو خاموش خاموش تھی۔ طبیعت پر عجیب سایو جمل پن تھا۔  
(وہ ایک ناریست ہے۔ فریب کار اور جھونا شخص۔ وہ آپ کو ہرث کرے گا اور وہ آپ کو بہت ہرث کرے  
گا۔)

(وہ ایک افسیاتی مریض تھا جو برینہ کے پیچھے پڑا تھا۔)

(محبت میں کوئی سیلف رسپیکٹ کوئی باوڈری نہیں ہوتی۔)

(ہلال وہ فاختہ ہے جس میں میری جان ہے۔ اور تم اسے اس جا وگر کی قید سے ضرور نکالو گی۔)

اس کے ذہن میں بہت سا شور تھا۔ وہ چپ چاپ کمرے میں آئی اور اپنے کھلے ہوئے بیگز کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”دو دن رہ گئے ہیں نکاح میں۔ اور ابھی تک اتنا کچھ رہتا ہے سمیٹنے والا۔“ ماہی بہت سے شاپنگ بیگز لیے  
کمرے میں داخل ہوئی تو اسے یونہی بیٹھنے دیکھ کے ٹھٹھک گئی۔

”تمہیں کیا ہوا؟“

”ماہی میں ٹھیک کر رہی ہوں؟ زیاد سے شادی کر کے؟“ اس نے عجیب الحصہ سے سوال کیا۔

”یار... یہ نکاح یہ پہلے کا ڈپریشن نا سب اڑ کیوں کو ہوتا ہے۔ رونا بھی آتا ہے۔ اور خوف بھی۔ تم بالکل ٹھیک  
کر رہی ہو۔ خالہ کی باتوں کو جھوول جاؤ۔ وہ امر یکر رہتی ہیں۔ ان کو کیا پتہ۔“ وہ بیٹھ کے کنارے پہ بیٹھی اور سمجھانے

والے انداز میں بولی۔ ”زیاد میں کوئی برائی نہیں ہے۔ ویسے بھی جب بھی کسی کا کسی سے رشتہ ہو، آدھا خاندان خلاف ہی ہوتا ہے۔“

مالا نے ایک نظر اپنے خالی بیڈ کو دیکھا۔

”ماں ہوتیں تو بتاتیں کہ کیا کرنا ہے۔“

ایک ہوک سی دل سے نکلی۔

”ماں نگیزہ آنٹی کو پسند کرتی ہوں یا نہ کرتی ہوں، وہ زیاد اور تمہارے رشتے پر خوش تھیں۔ یاد ہے نا؟“

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ سرا ثبات میں ہلا دیا۔

”ہاں۔ وہ خوش تھیں۔“

”پھر ماں پر بھروسہ کر کے شادی کرو۔“

وہ تم آنکھوں سے مسکرا دی۔

”چلو پینگ کرتے ہیں۔“ اس کا دل ہلکا چھالا سا ہو گیا۔ ساری لکفت بوجھل پن، سب ہوا ہو گیا۔

تحوڑی دیر بعد وہ دونوں بہت سلیقے ہے تمام اشیاء بیگز اور کارشنز میں رکھتی نظر آرہی تھیں۔ تبھی وہ ایک خیال کے تحت انٹھی اور الماری سے ایک باکس نکال کے لائی۔ وہ اپنی نے جیرت سے اس سرمنی خالی باکس کو دیکھا۔

”خالی باکس کیوں رکھ رہی ہو؟“

کشمائلہ مبین نے آنکھیں انٹھا کے اپنی بہن کو دیکھا۔ پھر جب وہ بولی تو اس کی آواز میں بہت سے قصے دفن تھے۔

”ہونا چاہیے۔ خالی باکس ہمیشہ ساتھ ہونا چاہیے۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہوٹل کے ڈائیننگ ایریا میں ناشتے کی خوبصوری تھی۔ سن رووف سے آتی روشنی نے سارے کو منور کر رکھا تھا۔ فاصلے فاصلے پر رکھی میز کرسیوں پر بیٹھے مہمان ناشتے میں مصروف تھے۔ وہ دونوں بھی ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ رات جب ڈھیر ساری آوارہ گردی کے بعد ڈیر بل واپس آیا تو خلاف موقع مہرنے اس سے کچھ نہیں کہا۔ نہ کوئی سوال۔ نہ کوئی حساب۔

”کل اس کی شادی ہے۔“ ڈیر بل اپنی پلیٹ پر جھکا دھیرے سے بولا۔ ”میں تمہاری جگہ ہوتا تو...“

ماہر نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

”کیا کرتے؟“

”جس لڑکی سے محبت کرتا، اس کی شادی روکنے کے لیے جنگ برپا کر دیتا۔“

”یعنی تمہیں ہر تیرے مہینے ایک جنگ برپا کرنی پڑتی۔“

بیربل نے خفگی سے نظریں اٹھائیں۔

”ابھی تک مجھے کسی سے ٹھیک سے محبت نہیں ہوئی۔ جب ہو گی تو سارے زمانے کو پتہ چل جائے گا۔“

”جو محبتیں تمہیں ابھی تک ہوئی ہیں، ان کا پتہ میرے بینک بیلننس کو لوگ چکا ہے،“ ایک برہم نظر اس پر ڈال کے وہ اپنی کافی میں دودھ انڈیلے لگا۔ سفید دھار سیاہ مائع میں انڈیلی جا رہی تھی۔ دھواں سانکل کے اوپر اٹھ رہا تھا۔

”حیرت ہے تم مجھ سے خفا نہیں ہوئے۔“ بالآخر وہ کہہ اٹھا۔ ماہر کل شام کے بارے میں کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ اسے اب بے چینی ہونے لگی تھی۔

”تم آزاد انسان ہو۔ اپنے فیصلے خود لے سکتے ہو۔ تم نے اسے بلا�ا۔ تمہاری مرضی۔“ اس نے بے نیازی سے کافی کا کپ لبوں سے لگایا۔ بیربل نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اسی انداز میں کہہ رہا تھا۔

”اسی طرح میں بھی ایک آزاد انسان ہوں،“ بیربل نہیں اپنے فیصلے خود لے سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے مہانہ الاؤنس (جیب خرق) کا نصف حصہ چیری میں میز پر رکھا۔“ نگاہیں اٹھا کے اسے گھورا۔

بیربل فرید کے ہاتھوں کے طوٹے ایک ہی جست میں اڑ گئے۔

”دنہیں نہیں۔ پلیز۔“ اس کی رنگت فتح ہوئی۔ ”میں معافی مانگتا ہوں۔ میں نے جان بوجھ کے نہیں کیا۔ میں نے اسے بھی بتا دیا تھا۔ سوری ماہر۔ پلیز۔“ اسے ناشتہ کافی سب بھول گیا تھا۔

تب ہی موبائل بجھنے لگا۔ اس نے بے زاری سے دیکھا۔

”تم نے اپنا موبائل آف کر رکھا ہے اور مالک صبح سے مجھے کا لز کیے جا رہا ہے۔ کن روپوں میں پھنس گیا ہوں میں؟“

”میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے اسے زیاد سلطان کے بارے میں معلومات لینے کے لیے کہا تھا۔ اگر وہ واقعی سبرینہ کا ملکیت تھا تو مالک کو معلوم ہونا چاہیے تھا۔ اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔“ وہ تلخی سے کہتے

ہوئے گونٹ بھرنے لگا۔

”کیا ہے، مالک؟“ بیربل نے براسامنہ بنائے کال اٹھائی۔

اگلے ہی لمحے اس کے تاثرات بد لے۔ کانٹا ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

”کیا ہوا؟“ ماہر نے چونک کے اسے دیکھا۔ کچھ تھا جو فضا میں ساکن ہو گیا تھا۔

بیربل نے دھیرے سے فون نیچے کیا۔

”ہمیں اسلام آباد جانا ہو گا۔“ اس کی رنگت سفید پڑ رہی تھی۔

”کیوں؟“

”تمہیں یاد ہے.... اسلام آباد پولیس کے پاس ہلال کا کیس تھا پچھلے دو سال سے۔ انہیں کچھ ملا ہے۔“

”کیا؟“ اس کا سانس رک گیا۔

”ہلال کی لاش۔“

ماہر فرید تیزی سے اٹھا۔ کافی کا کپ نیچے گرا۔ کانچ کے لکڑے اور گرم مائع دور تک بکھرتے گئے۔



(ہر سانس کے ساتھ کھو جاتا ہے گزر اہوالِ محہ)

سبز گھاس پہ ہر طرف سفید پھولوں کے ستون بنے تھے۔ ان کے درمیان چھوٹا لہا اسٹیچ تھا اور آس پاس کرسیوں کے پھول بچھے تھے۔ اسٹیچ بھی خالی تھا۔ ہر طرف مہمان نظر آرہے تھے۔ دو پھر کا وقت تھا اور لہرما کی میٹھی دھوپ سارے میں پھیلی تھی۔ کامدار لباس میں مسکرا مسکرا کے چلتی ہوئی ماہی ہر ایک سے مل رہی تھی۔ مہمان آنا شروع ہو چکے تھے۔

(اور شروع ہوتا ہے ایک نیا المحہ۔)

کارڈور میں بیساکھی کی بلک بلک سنائی دے رہی تھی۔ وہ سفید چہرے کے ساتھ لگنڈا کے چلتا آگے بڑھ رہا تھا۔ بیربل بھی شل سا اس کے ساتھ تھا۔ ساتھ موجود چلتا ہوا افیسر ہاتھ ہلاتے ہوئے کھدہ ہاتھا۔

”یہ ایک جلی ہوئی لاش تھی جو دو برس پہلے ملی تھی۔ انہی تاریخوں میں جب ہلال کھوئی تھی۔ ہم نے پہلے اس پر نظر نہیں کی لیکن ایک آفیسر اس دن آر کائیزو میں کچھ تلاش کر رہا تھا جب اسے لاش کے ساتھ ملنے والی چیزیں دکھائی دیں۔ ہم ان کی تصاویر مالک صاحب کو بھیجیں تو انہوں نے ان کو پہچان لیا۔ بچی کی عمر نو سال کے لگ بھگ تھی۔“

”آن وہ گیارہ سال کی ہوتی۔“ وہ بڑا بڑا یا۔

(ہم سنس اندر کھینچتے ہیں۔  
اور اسے باہر خارج کر کے  
ماضی کے لمحے کو چھوڑ دیتے ہیں)

اب وہ دونوں اٹیچ پہ بیٹھے تھے۔ اس نے سفید پشاور کے اوپر سفید کامدار دو پٹھے لے رکھا تھا۔ چوڑی دار بازوؤں کے آگے ہاتھوں پہ مہندی لگی تھی۔ اس کے کانوں اور گردن میں نازک ہیرے پر ڈونے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے ہیرے کی انگوٹھیوں سے بجھتا تھا۔ ایک کاغذ پر دستخط کر رہی تھی۔ چہرے پر اطمینان تھا۔ زیاد نہ دستخط کیے۔ اور ہر طرف مبارک بادیں گونجیں۔ دعاوں کے لیے ہاتھا لٹھا ہے۔

(اب وہ گزر الملح ہمارے لیے فنا ہو چکا ہے۔)

”میں نہیں مانتا۔“ بیربل دبا دبا سا چلایا تھا۔ وہ تینوں اس وقت ایک آفس میں بیٹھے تھے۔  
”جلی ہوئی لاش کا مطلب ہے کسی نے ہلال کے انغواؤ کو راپ کیا ہے۔ ہم قبر کی کھدوائی کروائیں گے۔ ڈی این کروائیں گے۔ وہ ہلال نہیں ہوگی۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔  
”ہے نا ماہر؟“ اس نے گردن موڑ کے اسے دیکھا جو سر جھکائے کہنیاں گھٹنوں پر رکھے بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں زپ لاک بیگ پہ جمی تھیں جس میں مختلف اشیاء تھیں۔  
”ہے نا ماہر؟“

”its her“ وہ زیر لب بڑا بڑا یا۔ بیربل کا سنس رکنے لگا۔

(اور یہ کرتے ہوئے  
ہم فنا کر دیتے ہیں  
اس انسان کو  
جو ہم ایک لمحہ پہلے تھے۔)

وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ زیاد سلطان سیاہ لباس میں تھا اور وہ سفید میں۔ وہ دونوں کیمراز کو دیکھ کے مسکرا رہے تھے۔ سامنے کھڑی ماہی ان کی تصاویر کھینچ رہی تھی۔ ایک طرف وہیں چیز پہ بیٹھی گئیں بیگم بھی مسکرا کے ان کو دیکھ رہی تھیں۔ زیرِ لب وہ کچھ پڑھ بھی رہی تھیں۔ ہاتھ میں تسبیح تھی۔

(ہم انس اندر کھینچ کے  
نئے لمحے میں انس لے کر  
اس شخص کا استقبال کرتے ہیں  
جو ہم بننے جا رہے ہیں۔)

ماہر نے بے جان ہاتھوں سے زپ لاک بیگ اٹھایا۔ اس کے اندر کچھ چیزوں تھیں۔ دو سال پہلے ایوی ڈنس ملنے کی تاریخیں بھی لکھی تھیں۔ ان پر گرد بھی تھی جیسے وہ پرانے باس سے نکالی گئی ہوں۔ ایک بلاہیلیٹ۔ لباس کے جلے ہوئے نکل رہے۔ نتمہ سا پرس۔  
اور ایک سینٹڈ کینڈل۔

اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے کینڈل کا جار نکالا۔ اسٹر ابری۔  
اس نے ڈھکن کھولا۔ ایک اداستی خوشبو سفید مووم سے نکل کے سارے میں پھیلنے لگی۔  
”یہ ہلال ہے۔“ اس کی آواز شکست خور دی تھی۔

(اور یوں ہم تمام عمر

اسی عمل کو دھراتے رہتے ہیں۔)

زیادا س کا ہاتھ تھامے اسے لاوٹھ سے کمرے تک لارہا تھا۔ لاوٹھ میں آج پھر بہت بلکل روشنی تھی۔ گھر میں کوئی بتیاں بھی نہیں جلائی گئی تھیں۔ اس نے مسکرا کے سر جھکا۔ اسے اس سب کی پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

کمرہ اندر پھولوں سے سجا تھا۔

سفید اور سرخ پھولوں۔

ہر طرف خوبصورتی تھی۔ اور ایک نئے مستقبل کا آغاز۔

(بھی مراقب ہے۔)

”آپ چاہیں تو ہم قبر کھدا سکتے ہیں۔ لاش کے دانتوں سے ہم....“

”ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہلال ہے۔“ اس نے کینڈل کا ڈھلن بند کیا۔

”یہ اسی کی چیزیں ہیں۔“ اس نے چہرہ اٹھایا تو وہ ہر سوں کا پیار گلتا تھا۔

”ماہر ہمیں ڈی این اے تو کروانا چاہیے۔“ بیربل نے بے بھی سے اس کی کہنی جھنجھوڑی۔ اس نے نگاہیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ روم ۵۵۵ میں بھی ایسا یہاں نہیں لگا تھا جیسے آج لگ رہا تھا۔  
ایسے جیسے شاک میں ہو۔

”ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کی قبر کے ساتھ یہ بے حرمتی نہیں کرنا چاہتا۔ اٹھو۔ ہم استنبول واپس جا رہے ہیں۔“ اس نے زپ لاک میں چیزیں واپس ڈالیں اور اسے اتنی سختی سے پکڑا کہ ہاتھ کی ریگیں ابھر آئیں۔

”میری تلاش ختم ہوئی۔“

(بھی تجدید ہے۔)

وہ اس کے سامنے بیٹھ کے کنارے پہ بیٹھا تھا۔

مالا نے مسکرا کے ہاتھ آگے کیا۔ اور اس نے مخملیں ڈبیا سے ایک انگوٹھی نکالی۔ چوکور چمکتا ہوا نگینہ چپکا۔  
 ”یہ وہی ڈانمنڈر نگ ہے۔ میں نے اسے آپ کے لیے خرید لیا تھا۔ کیونکہ یہ بہترین تھی۔“  
 اس نے انگوٹھی مالا کی انگلی میں پہنائی۔ مالا نے مسکرا کے ہاتھ اوپنچا کر کے روشنی میں انگوٹھی کو دیکھا۔  
 اگلے ہی لمحے کشمائلہ مبین کی مسکراہٹ مدھم ہوئی۔ اس نے چونک کے زیاد کو دیکھا۔ پھر انگوٹھی کو۔ زیاد مسکرا کے  
 کچھ اور بھی کہہ رہا تھا۔ ایک نئی زندگی کے خواب۔ مستقبل کی باتیں۔ لیکن وہ صرف انگوٹھی کو دیکھ رہی تھی۔  
 کمرے کی مدھم روشنیوں میں بھی وہ بتاسکتی تھی کہ.....  
 یہ ہوبہ اس چوکور ہیرے جیسا نگینہ زرقوں تھا۔ ہیرا نہیں۔  
 یہ انگوٹھی نفلی تھی۔

(بھی زندگی ہے۔)



بیدروم میں لگے چھولوں کی بیتاں مر جھائی تھیں اور خوشبو باسی ہو گئی تھی۔ دروازہ نیم واتھا اور لاونچ سے خوش  
 گپیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ماہی کا قہقہہ سب سے اوپنچا تھا۔ عبا دا اور ماہی ان کا ناشتہ لائے تھے۔ معید کی حسب توقع کا ل تھی اور وہ شادی کے لیے اتنی چھٹی لے چکا تھا کہ  
 اب اسے وارڈ میں واپس پہنچنے کی جلدی تھی۔ سو فی الحال وہی دونوں اس کے میکے کی نمائندگی کلراہے تھے۔ نگینہ بیگم  
 بھی باہر ہی بیٹھی خوشگوار مھفل کا حصہ بنی ہوئی تھیں۔ زیاد کی بھی بنس کے کوئی قصہ سناتی آواز یہاں تک آرہی تھی۔  
 صرف وہی تھی جواندہ تھی۔

سنگھار میز کے سامنے بیٹھی وہ آئینے میں جھلکتے اپنے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کمرے میں کچھ لینے آئی تھی۔ پھر  
 یہیں بیٹھ گئی۔ اس نے جھیل کے رنگ کی سبز کامدار لمبی قمیض پہن رکھی تھی۔ کندھے پہ دو پٹھے تھا۔ کانوں میں سونے  
 کے نخے سے ٹاپس تھے۔ اور چہرے پہ ایسی سوچ تھی جس نے لباس کی چمک کو گہنا دیا تھا۔

”کیا اسے زیاد سے پوچھنا چاہیے؟“ اس نے ہاتھ اٹھا کے اوپنچا کیا۔ تیز روشنیوں میں انگوٹھی کا نگینہ چپکا۔  
 ہیرے جیسا۔ لیکن وہ ہیرا نہیں تھا۔ وہ زرقوں تھا۔ اس کی چمک ہوا لگتے ہی ماند پڑنے لگی تھی۔

”شاید زیاد کے ساتھ کوئی دھوکہ ہو گیا؟ شاید کسی دوسرے جیولرنے اس سے ڈائمنڈ کی قیمت لے کر زرقوں بیچ دیا ہو؟ اونہوں“۔ اس نے سر جھکا۔ اس کے جیولر سے زیاد نے جتنے سوالات پوچھتے تھے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے بنا سڑپنیکیٹ کے ڈائمنڈ خرید لیا ہو۔ وہ بھی اتنا مہنگا؟

”کہاں رہ گئی ہو؟“ ماہی مسکراتی ہوئی چوکھت میں آئی تو وہ چونکی۔ پھر جلدی سے مسکرا ہٹ چہرے پر طاری کی اور برش اٹھالیا۔

”بس آرہی ہوں۔“ آئینے میں دیکھتے ہوئے وہ برش جلدی جلدی پھیرنے لگی۔ حالانکہ بال پہلے ہی بلوڈرائی سے سیٹ تھے۔

”ارے واہ۔ یہ زیاد نے دی ہے انگوٹھی؟“ آئینے کا سائز دور سے ہی ماہی کی آنکھوں میں چکا۔ وہ چمک کے قریب آئی۔ مالانے بھلی کی تیزی سے ہاتھ نیچے کیا لیکن ماہی لپک کے آئی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر مسکرا ہٹ غائب ہوئی۔ چونک کے مالا کو دیکھا۔

”یہ زرقوں ہے۔“ وہ الجھائی۔ ”ڈائمنڈ رنگ نہیں دی؟ تم لوگوں نے تو کوئی دون کیرٹ پسند کیا تھا۔ نہیں؟“ مالانے تیزی سے ہاتھ چھڑایا۔

”ہاں لیکن میں اتنی مہنگی انگوٹھی کے حق میں نہیں تھی۔ میں نہیں تھی۔“ اسے کہا کہ زرقوں لے لیں۔ ڈائمنڈ پر اتنے پسے کون خرق کرے۔“

”مگر ویڈنگ رنگ روز روز تو نہیں بنتی۔ اور نگینہ آنٹی نے خالہ کو بھی سیٹ دیا ہے۔“ اسے کہا۔ اور مجھے ٹاپس۔ وہاں پسے خرق نہ کرتے۔ انگوٹھی تو ڈائمنڈ کی لے لیتے۔“ ماہی خود سے بول رہی تھی جیسے اسے پچھا اچھا نہ لگا ہو۔ پھر ایک دم اسے دیکھا۔ جیسے چونکی ہو۔

”زیاد نے تمہیں بتا کے ہی زرقوں رنگ دی ہے نا؟ کہیں ڈائمنڈ کہہ کے زرقوں تو نہیں تھا دیا؟“ برش کرتا اس کا ہاتھ سست ہوا۔

(زیاد سلطان مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔) ایک آواز کانوں میں گوٹھی۔

”آف کورس۔ ہم نے خود پسند کی تھی نا۔“ اس نے جی کڑا کے کہا۔ اسے اپنے شوہر کا دفاع کرنا تھا۔ ہر قیمت پر۔

”اچھا میرا گفت کھول کے دیکھا؟“ ماہی نے بغور اسے دیکھتے ہوئے بات بدل دی۔

”انتنے گفتگو دیے ہیں تم نے۔ کون کون سا کھلوں؟“

”آخری والا سب سے بیٹ تھا۔ وائٹ اور بلیک باکس میں۔ آرام سے کھول لینا۔ آجاؤ سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

اس کے جانے کے بعد مالانے چہرے پر مسکرا ہٹ سجائی اور انٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ شادی کے بعد اسے بہت سی مسکرا ہٹیں چہرے پر زبردستی سجائی پڑیں گی۔

گھریال بارہ بجانے کے قریب تھا۔ اور کوئی سحر تھا جوٹوٹنے والا تھا۔ اسے اپنے کانچ کے جو تے سن جانے تھے۔ (شاید زیاد کے پاس پیسے نہ ہوں۔ میں اس سے پوچھ چکھ کروں تو اس کو برالگے۔ اس کا دل دکھے۔ اونہوں۔)

”انکل کہاں ہیں؟“

جب وہ لوگ ماہی اور عباد کو چھوڑنے دروازے تک آئے تو ماہی نے پھر سے پوچھا۔ وہ یہ سوال کئی دفعہ پوچھ چکی تھی۔

”ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ لیٹے ہوئے ہیں۔“

”وہ فناشن میں بھی تھوڑی دیر کے لیے آئے پھر چلے گئے۔“ اس نے اب کے غور سے ان دونوں کو دیکھا۔ زیاد اور ملا ڈرائیورے میں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ڈھوپ ان کے اوپر سیدھی پڑ رہی تھی۔ مالا مسکرا ہی تھی لیکن اس کی مسکرا ہٹ میں کچھ تھا۔ کچھ غیر آرام دہ سا۔ وہ البتہ ممکن اور اچھے موڑ میں نظر آ رہا تھا۔ ”ان کی نیچر ہی ایسی ہے۔ زیادہ گھلتے ملتے نہیں ہیں۔“ زیاد سلطان نے اسی مسکرا ہٹ سے جواب دیا۔ اس کے سکون میں ذرا فرق نہیں آیا۔

بنگالی ملازمہ خاموشی سے ان کی کار میں سوئیٹس اور چاکلیٹس رکھوار ہی تھی۔ ماہی بظاہر مسکراتے ہوئے کار میں بیٹھی۔ عباد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار ریسورس کرنے لگا۔ ملا اور زیاد ان کے جانے تک وہیں کھڑے رہے۔

جیسے ہی کار سڑک پر نکلی ماہی کی مسکرا ہٹ غائب ہوئی۔ اس کے چہرے پر ایک پرسوچ جنم لینے لگی۔

”ایک چاکلیٹ پکڑانا۔ لمبی ڈرائیو ہے گھر تک۔“ عباد نے ایک ہاتھ سے اسٹینر گٹ تھامے، دوسرا ہاتھ پیچھے رکھے سوئیٹس کے تھال کی طرف بڑھا یا ہی تھا کہ ماہی نے زور سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ وہ چونک کے اسے دیکھنے لگا۔

”ایک چاکلیٹ ہی مانگی ہے یار۔“

”رہنے دو۔ نری کیلو ریز ہیں۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کے ڈبے بیک سیٹ پر مزید پرے دھکیل دیا۔ اب وہ عباد کی پہنچ سے باہر تھا۔

”عجیب جیلس عورت ہوت۔“ عباد بڑا کے رہ گیا جیسے حیرت ہوئی ہو۔

ماہی نے جواب نہیں دیا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پہل تھے۔

وہ دونوں واپس لاڈنچ میں آئے تو بنگالی ملازمہ نے بتیاں ایک دفعہ پھر سے بلکی کر دیں۔ مالا نے سب کے آنے پہ بتیاں تیز کی تھیں۔ پردے کھولے تھے۔ لیکن پل بھر میں ملازمہ نے سب واپس پہلے جیسا کر دیا تھا۔ اندھیرا اور خاموش۔ اسے الجھن ہونے لگی۔ بیٹھنے سے پہلے سوچ پہ ہاتھ مارا اور بتیاں روشن کر دیں۔  
نگینہ بیگم اپنے تنہ پہ نیم دراز تھیں۔ کمبل اوڑھے۔ گاؤں تکیے سے ٹیک لگائے۔ تیز روشنی پہ چونک کے اسے دیکھا۔

وہ بس مسکرا کے اپنی کرتی تک آئی۔ فریاد اور وہابی بھی بیٹھنے ہی تھے کہ بتی ایک دم بلکی ہو گئی۔

مالا نے بے یقینی سے گردن موڑی۔ بنگالی ملازمہ سوچ کے ساتھ کھڑی جاتی نظر وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے فوراً سے ان دونوں کو دیکھا لیکن وہ اس طرف دانتہ طور پر متوجہ نہیں تھے۔ شاید انہیں بھی اندھیروں میں رہنے کی عادت تھی۔ اور وہ روشنیوں سے آئی لڑکی تھی۔  
اس نے پہلو بدلا۔ کہا کچھ نہیں۔

”بس اب تو میں منتظر ہوں کہ کب ہم سب واپس دہنی جائیں اور ایک گھر میں ایک ساتھ رہیں۔“

نگینہ بیگم محبت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ مالا بھی مسکرا دی۔ کلفت دور ہونے لگی۔

”ہم آپ کے ساتھ نہیں رہیں گے۔“

زیادٹا نگ پٹا نگ جمائے بیٹھا بہت سنجیدگی سے بولا۔

جہاں نگینہ بیگم چونکیں وہاں مالا نے بھی تعجب سے اسے دیکھا۔

”لیکن نگینہ آئٹی کا خیال کون رکھے گا؟“

”اندرانی ہے ن۔ وہ رکھ لے گی۔“

نگینہ بیگم سانس رو کے اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

”ن... زیاد.... تم نے کہا تھا کہ ہم ساتھر ہیں گے۔“

”ہاں اور اب میں کہہ رہا ہوں کہ ہم ساتھ نہیں رہیں گے۔“ وہ بس اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا۔ دو ٹوک، قطعی  
انداز۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

”لیکن زیاد... ایک شہر میں رہتے ہوئے ہم الگ رہیں؟ اچھا لگتا ہے کیا؟“ اس نے نرمی سے کہنا چاہا۔

”کس نے کہا ہم ایک شہر میں رہیں گے؟“

اس نے پہلے بیوی اور پھر ماں کو دیکھا۔ انداز بالکل پر سکون تھا۔

”کیا مطلب؟“

”میں اور کشمائلہ مکہ شفت ہو رہے ہیں۔ آپ ذہنی طور پر خود کو تیار کر لیں۔“

نگینہ بیگم کا دل جیسے کسی نے منٹھی میں دبایا۔

”مکہ؟“ وہ حیران رہ گئی۔ ”مکہ کہاں سے آگیا؟ آپ نے تو کہا تھا کہ ہم...“

اور اس لمحے سے احساس ہوا کہ زیاد سلطان نے ہمیشہ ایک نئے شہر جا کے نئی زندگی شروع کرنے کی بات کی  
تھی۔ اس نے کبھی اس شہر کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتی رہی کہ وہ دینی میں جا بُدھو مذہر ہی ہے، دینی میں یہ اور یہ  
کرے گی۔ وہ آگے سے ہوں ہاں کرتا رہتا تھا۔

”لیکن زیاد... میں مکہ میں کیا کروں گی؟ مجھے دینی میں جا بُدھی ہے۔“ آپ آٹھی کو چھوڑ کے ہم...“ اسے  
شدید صدمہ لگا تھا۔ باتِ مکمل ہی نہیں ہو پائی۔

”زیاد... ایسے کیسے بیٹا...“ نگینہ بیگم ہنوز بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

”مجھے آفس نے مکہ ٹرانسفر کر دیا ہے۔ میں وہیں سے کام کروں گا۔ اور تم وہاں کوئی جا بُدھو مذہر لیما۔“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ فون بختنے لگا۔ خالہ کی کال آرہی تھی۔ وہ ماہی اور عباد کا پوچھنا چاہتی ہوں گی۔ وہ  
ایکسکیو زمی کہہ کے اٹھ گئی۔ کچھ مضمضہ محل کچھ غائب دماغ سی وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

زیاد نے اسے جاتے دیکھا۔ جب وہ باہر نکل گئی تو وہ ماں کی طرف مڑا۔

وہ ابھی تک بے یقینی سے جیسے دل تھام کے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”تم مجھ سے دور چلے جاؤ گے؟“

”پھر کیا کرو؟ اس کو آپ کے ساتھ ایک گھر میں رکھوں تاکہ ابواس کو دو دن میں آپ کی اصلاحیت بتا دیں؟“ وہ قریب ہو کے دبا دبا ساغرا یا۔

”میں سنبھال لیتی۔“

”ہرگز نہیں۔ میں اپنی شادی قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ اور میں آپ کے قریب نہیں رہنا چاہتا۔“

”تمہاری شادی میں نے کروائی ہے۔ میں نے۔ انہوں نے کپکپاتی بوڑھی انگلی اپنے سینے پر رکھی۔ آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

”اور میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن میں اسے آپ کے قریب نہیں رکھوں گا۔“

”مکہ؟ مکہ کیوں؟“ وہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ انگلی نیچے گر گئی۔

”میری اپنی وجہات ہیں۔“ وہ پیچھے ہو کے بیٹھ گیا۔

اس نے خالہ سے بدقت بات کی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ نقلی انگوٹھی انگلی کاٹ رہی تھی۔ پھر وہ کمرے سے نکلی۔ زیاد لا ونچ میں نہیں تھا۔ نگینہ بیگم مصمی اپنی جگہ بیٹھی تھیں۔ وہ اس وقت ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ابھی واپس پہنچنے ہی لگی تھی کہ.....

پھر بر تھڈے ٹو یو.....

پھر بر تھڈے ٹو یو.....

موسیقی کی دھن ساعتوں میں گونجنے لگی۔ وہ جہاں تھی، وہیں سن رہ گئی۔ پھر بے اختیار آواز کی سمت دیکھا۔ وہ راہداری کے سرے پر نصب ایک دروازے کے پیچھے سے آرہی تھی۔ اسے اتنا معلوم تھا کہ دروازہ پیسمنٹ کی طرف کھلتا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

پھر بر تھڈے ٹو یو.....

موسیقی کی آواز باندھوتی جا رہی تھی۔



اپارٹمنٹ کے دروازے کے باہر فریڈ لارکی تختی لگی تھی۔ آج اس تختی نے خاموشی سے ان دونوں کو کیے بعد دیگرے اندر آتے دیکھا۔ بیربل بالکل ٹھہر تھا۔ اور ماہر خاموش۔ جیسے شل ہو۔ کسی اور دنیا میں گم ہو۔ وہ بیساکھی سے چل رہا تھا۔ وہیں چھیرنے جانے کہاں رہ گئی تھی۔

بیربل اندر آیا اور جو توں سمیت آگے بڑھتا گیا۔ لوگ روم خالی تھا۔ فیضی حامم کو اس نے واپس آنے کی اطلاع نہیں کی تھی۔ شاید ماہر نے بھی نہیں بتایا تھا کیونکہ وہ گھر پہ نہیں تھیں۔ ماہر نے سارا راستہ اس سے بات بھی نہیں کی تھی۔ وینگ لاونچ۔ ائیر پورٹ۔ فلاٹ۔ ایگزٹ۔ وہ خاموش رہا تھا۔ جیسے ابھی تک شاک میں ہو۔

سیاہ سفید لوگ روم خاموش پڑا تھا۔ بیربل آگے بڑھا اور آہستہ سے ایل شوپ سیاہ صوف پر گرسا گیا۔ ایک بازو نیچ جھول گیا۔ انگلیاں قالین کو چھو نے لگیں اور نظریں جھبت کے فانوس پر تھیں۔

ماہر نے دھیرے سے دروازہ بند کیا۔ زیرلب اعوذ باللہ پڑھا۔ لاک کرنے کی آواز آئی۔ پھر اس نے جھک کے جوتے اتارے۔ پھر بیساکی کی تک تک سنائی دی۔

وہ لنگڑا کے قدم قدم چلتا سامنے آیا۔ بیساکھی رہا تھے سے پھسل گئی۔ اس نے جھک کے میز پر اسٹرائری والی کینڈل کا جار رکھا۔ وہ سارا راستہ اسے تھامے رہا تھا۔

”دو سال سے تم کہہ رہے تھے کہ وہ زندہ ہے۔ اور آج دیکھو۔“

بیربل جھبت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آواز گیلی تھی۔ انکھیں تم تھیں۔ غصہ۔ گلہ۔ کیا نہیں تھا اس کی آواز میں۔ اس کی امید ٹوٹی تھی۔ وہ جھوٹی امید جو ماہر نے اسے تھامائی تھی۔

”ہا۔“ اس نے اعتراف کیا۔ بیربل کو اس کی امید نہیں تھی۔ لیکن وہ شاک میں گلتا تھا۔

”ہا۔ دو سال سے میں کہہ رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اور آج دیکھو۔“

وہ جھکا اور بیساکھی اٹھائی۔ پھر لنگڑا تاہوا آتش دان کی طرف بڑھنے لگا۔

”میں نے کہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ سب کہتے تھے باز آ جاؤ۔ لیکن میں تمہیں اور مالک کو لیے ایک ملک سے دوسرے ملک پھرتا رہا۔ میں نے دو سال تک تم لوگوں کو امید دلائی۔ کیونکہ میرا دل کہتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔“

آتش دان تک وہ رکا اور لائٹر اٹھایا۔ بیساکھی پھر سے لڑھک گئی۔ ماہر نے تکلیف سے اسے دیکھا۔ پھر بیربل کو۔ وہ دور تھا۔ قریب ہوتا، تب بھی آج وہ بیساکھی اٹھانے نہ کھڑا ہوتا۔

”کوئی میرا یقین نہیں کرتا تھا۔ اور میں کہتا تھا کہ میں تم سب کو ثابت کر کے دکھاؤں گا۔“ وہ خود سے بول رہا

تھا۔ لائٹر لیے اس نے چلنے کی کوشش کی۔ میز تک کافی فاصلہ تھا۔ ٹانگ پر زور دے کر ایک قدم اٹھایا۔ دوسرا۔ اور تیسرا سے پہلے وہ ایک دمڑھک کے گرا۔

”تمہارا جنون... جھوٹی امید کے سوا کچھ نہیں تھا۔“ بیربل نے بس ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ پہلو کے بل قالین پر گرا تھا۔ شاید کراہا بھی تھا۔ لیکن بیربل نہیں اٹھا۔ اس نے اسے گرے رہنے دیا۔

”میں نے تم سب کا بہت وقت لیا۔ اور اپنا بھی۔ کیونکہ...“

وہ ہتھیلیوں کے بل سیدھا ہوا۔ پھر سے کراہا۔ صوفے کا سہارا لے کر سیدھا ہوا اور خود کو گویا گھستیتے ہوئے میز تک لا یا۔

”کیونکہ میرا دل نہیں مانتا تھا۔ اور دیکھو...“

وہ ٹھہر سا وہیں میز کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹانگ میں درد کی شدید یہ ریس اٹھنے لگی تھیں۔

”اور دیکھو۔ آج تم غلط نکلے۔“ بیربل نے بے بسی بھرے غصے سے اس کا فقرہ مکمل کیا۔ ماہر فرید نے لائٹر کے ایورپی انگوٹھا زور سے رگڑا۔ شعلہ جل اٹھا۔

”میں یہ نہیں کہنے جا رہا تھا۔“

اس نے شعلہ موم بیتی کے قریب کیا۔ وہ اس کے جعلے ہوئے دھاگوں سے ذرا دور تھا۔

”میں کہنے جا رہا تھا کہ... دیکھو.... آج میں درست ثابت ہوا۔“

اس نے شعلہ دھاگے سے نکلا یا۔ اس نے فوراً سے آگ پکڑ لی۔

بیربل فرید تیزی سے سیدھا ہوا۔ ایک الارم سا اس کے کانوں میں بخنے لگا تھا۔

”کیسے؟“

”ہلال کی تمام چیزوں پر گرد تھی۔ زپ لاک کھلے ہوئے تھے۔ گرد کا ہونا فطری بات ہے۔ لیکن....“ اس نے اسٹر ابری کینڈل کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کی موم سفید اور صاف تھی۔ خوبصورتی برقرار ہے جب کہ اس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔ دو سال تک کینڈل ڈھکن کے بغیر رہے تو اس کی خوبصورتی ہو جاتی ہے۔“

وہ قالین پر بیٹھا جلتے ہوئے شعلے کو دیکھ کے کہہ رہا تھا۔

”کیا مطلب؟“



”کیا تم اب تک نہیں سمجھی ہو کہ ماہر تمہیں کینڈلز کیوں دیتا ہے؟“  
ہلال کی آنکھیں چمکیں۔ اس نے تیزی سے کینڈل اٹھا کے دیکھی۔  
اس کے دھاگے سیاہ تھے۔

وہ ایک دم کمرے میں بھاگی۔ رانیل مسکرا کے اسے دیکھنے لگیں۔  
وہ واپس آئی تو اس کے بازوؤں میں بہت سی چھوٹی بڑی کینڈلز تھیں۔ اس نے سارے جارز جلدی جلدی میز پہ  
سیٹ کیے۔

”سب کے دھاگے جلنے ہوئے ہیں۔ لیکن موم کم نہیں ہے۔ یعنی ماہر بھائی گفت دینے سے پہلے نئی کینڈل کو  
ایک دفعہ ضرور جلاتا ہے۔ لیکن کیوں؟“ وہ جوش سے ماں کو سمجھا رہی تھی۔  
پھر اس نے لائٹ لیا اور باری باری موم بتیوں کے دھاگے جلانے لگی۔ دھیرے دھیرے ساری موم بتیاں آگ  
پکڑنے لگیں۔

”بہت دیر سے سمجھ میں آیا تھیں لے۔“  
رانیل مسکرا کے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ بہت خوشی سے جلتی کینڈلز کو۔  
پہلی کینڈل کی موم پکھلنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ پوری پکھل گئی۔ ہلال نے دھڑکتے دل سے ٹویز راٹھایا اور اسے  
پکھلی موم کے اندر ڈالا۔ جب اسے واپس اوپر نکالا تو اس کے دانتوں میں ایک شہر کی لاکرٹ تھا۔  
”ماما ماما...“ اس نے جوش سے چیخ ماری۔ اس کا چہرہ خوشی سے تتمارا تھا۔

”ماہر بھائی مجھے کینڈل میں گفت چھپا کے دیتا تھا۔“  
موم پکھل رہی تھی۔ خوبصورتیں ایک دوسرے میں مکس ہو کے سارے کو معطر کر رہی تھیں۔ اور وہ ایک کے بعد  
ایک موم بتی سے کچھ نکال رہی تھی۔ نیل پاش۔ ہنیر پن۔ کینڈی بار۔ کچھ پلاسٹک میں لپٹا تھا اور کچھ بغیر پلاسٹک  
کے۔

”اتی دیر گلی تھیں اپنے بھائی کو سمجھنے میں۔“ رانیل مسکرا کے اس کو دیکھ رہی تھیں۔ میز موم سے لھڑی چیزوں  
سے بھر گئی تھی جن کا موم باہر آتے ہی جمنے لگا تھا۔ وہ اب ہستے ہوئے اپنے تھفون پہ جبی موم ناخنوں سے کھرچ رہی  
تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسٹر ابری کی مہک والی کینڈل پکھل رہی تھی اور بیربل فرید سانس رو کے اسے دیکھ رہا تھا۔

”لیکن ہماری بہن زندہ ہے۔ اور...“

ماہر نے سر جھکا کے موم ہتی کے جار کے اندر جھانکا۔

اس کے چہرے پہ بالآخر ایک مسکراہٹ ابھری۔ ایک مکمل مسکراہٹ۔

”اور اس نے مجھے ایک پیغام بھیجا ہے۔“ اس نے ٹوئیز راٹھایا اور پکھلی موم میں ڈال دیا۔ بیربل بنا پلک جھپکائے اسے دیکھ رہا تھا۔

ٹوئیز رموم کے اندر ڈوب گیا۔

اور جب ماہر کی انگلیوں نے اسے باہر نکالا تو اس کے دانتوں میں کچھ تھا۔

”وہ موم میں لمحڑی شے کو دیکھ کے فخر سے مسکرا یا۔“ Smart kid, isn't she?”

(باتی آئیندہ ماہ، ان شاء اللہ)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆